ماہ رمضان المبارک میں نماز تراویح کے ساتھ

دورہ ترجمہ قرآن

کی سعادت

مسجد جامع القرآن، قرآن اکیڈمی، خیابان راحت، ڈیفنس فیزVI کراچی میں

امیر تنظیم اسلامی و صدر مؤسّس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد

حاصل کر رہے ہیں

☆

لاہور میں **دورہ ترجمہ قرآن** کے پروگرام

1۔ قرآن اکیڈمی (36 کے ماڈل ٹاؤن)

مدرس : خالد محمود عباسی، ناظم تنظیم اسلامی حلقہ آزاد کشمیر

عشاء کی نماز ساڑھے سات بجے کھڑی ہوتی ہے

2۔ دارالقرآن، ۱۷۔ اللہ بخش سٹریٹ، عمر دین روڈ، وسن پورہ لاہور

مدرس : جناب عبدالرزاق، ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان

قریبی مسجد میں تراویح ادا کرنے کے بعد دورۂ ترجمہ قرآن 8:30 تا 10:30 بجے شب

3۔ مسجد التوحید، 11۔ انفنٹری روڈ، متصل ABF فاؤنڈیشن سکول

مدرس : جناب اقبال حسین، امیر تنظیم اسلامی لاہور شمالی

ترجمہ مع مختصر تشریح، بعد از تکمیل تراویح، قریباً ساڑھے دس بجے شب تک

(تسلسل کے لئے بیک ٹائٹل کا اندرونی صفحہ ملاحظہ کیجئے)

وَمَن يُؤتَ الحِكمَةَ فَقَد أُوتِيَ خَيرًا كَثِيرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

ماھنامہ

حِکمتِ قرآن

لاھور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۱۷ | رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ — جنوری ۱۹۹۸ء | شمارہ ۱

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: اا داؤد منزل متصل شادی ہال، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

حرفِ اول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دورۂ ترجمۂ قرآن

دعوت رجوع الی القرآن کا اہم سنگِ میل

رمضان المبارک نزولِ قرآن کا مہینہ ہونے کی نسبت سے قرآن حکیم کے ساتھ تجدیدِ تعلق کا مہینہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مہینے میں اہل ایمان کو جو دوگونہ پروگرام عطا کیا گیا ہے اس میں قرآن حکیم کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یعنی دن کے روزے کے ساتھ ساتھ رات کے قیام کے دوران قرآن حکیم کی قراءت اور اس کا استماع ـــــ لیکن ہمارے ہاں عام طور پر قراءت و استماعِ قرآن کا جس طور سے اہتمام کیا جاتا ہے اس کے ذریعے قرآن حکیم کے فیوض و معارف سے بہت کم استفادہ ممکن ہے۔ نمازِ تراویح ادا کرنے والے مقتدی حضرات کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کم سے کم وقت میں اس سے فارغ ہو کر گھر کی راہ لیں۔ ان کی اس خواہش کے احترام میں قاری حضرات قرآن مجید کی تلاوت اس قدر تیزی کے ساتھ کرتے ہیں کہ کلام اللہ کے الفاظ باہم گڈمڈ ہوتے ہیں اور اکثر و بیشتر یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ قرآن حکیم کا کونسا حصہ تلاوت کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف عربی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے آیاتِ قرآنیہ کا مفہوم سرے سے پتہ ہی نہیں چلتا۔

اس صورتحال کے پیش نظر رمضان المبارک میں قرآن حکیم سے بیش از بیش استفادے کی خاطر آج سے چودہ سال قبل مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے صدر مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ العالی نے رمضان کی راتوں میں نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز فرمایا تھا۔ ہر چار تراویح سے قبل تراویح میں تلاوت کئے جانے والے قرآن حکیم کے متن کے ساتھ ترجمہ کا یہ پروگرام' بحمداللہ' نہایت مفید رہا۔ اس کے بعد سے محترم ڈاکٹر صاحب' اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوجود' ہر رمضان میں دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کرتے رہے ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اب ان کے بہت سے ساتھی بھی دعوت رجوع الی القرآن کے کام میں شریک ہیں اور دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام ملک کے طول و عرض کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی منعقد ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اس مرتبہ حافظ عاکف سعید صاحب نیویارک میں دورۂ ترجمہ قرآن کروا رہے ہیں' جہاں قبل ازیں محترم ڈاکٹر صاحب انگریزی زبان میں دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ محترم ڈاکٹر صاحب قرآن اکیڈمی کراچی میں دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ دعوت رجوع الی القرآن کے اس نقیب کو صحت و عافیت کے ساتھ قرآن کے پیغام کی نشر و اشاعت کی توفیق اور ہمت عطا کئے رکھے۔ آمین!!

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب' از : ڈاکٹر اسرار احمد

درس ۹

اثباتِ آخرت کیلئے قرآن کا استدلال

سورۃ القیامہ کی روشنی میں (۲)

○

پہلی دو آیات : قیامت کے دن اور نفسِ ملامت گر کی قسم

﴿ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ ﴾

"نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی ـــ اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی!!"

سورۃ القیامہ کی ابتدائی دو آیتوں میں وارد شدہ قسموں میں اللہ تعالیٰ نے اس تمام استدلال کو کمال ایجاز و اعجاز کے ساتھ سمو دیا ہے جو اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کے ضمن میں طویل مکی سورتوں میں شرح و بسط اور اطناب و تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

ان دونوں قسموں کے نفسِ مضمون پر کلام سے قبل اس حرفِ نفی یعنی "لَا" کے بارے میں وضاحت مناسب ہے جو دونوں قسموں سے متصلاً قبل اور دونوں آیتوں کے شروع میں آیا ہے۔ یہ قرآن حکیم کا ایک خاص اسلوب ہے جو اس سورۂ مبارکہ کے علاوہ قرآن مجید کی چھ مزید سورتوں (الواقعہ' الحاقّہ' المعارج' التکویر' الانشقاق اور البلد) میں بھی وارد ہوا ہے' اور اس کے بارے میں اگرچہ بعض دوسری آراء اور تاویلات بھی موجود ہیں' تاہم بہترین رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ یہ رسم الخط کے اعتبار سے تو "لاءِ متصل" نظر آتا ہے' لیکن واقعتاً "لاءِ منفصل"

ہے' یعنی حرفِ نفی "لَا" علیحدہ ہے اور "اُقْسِمُ" علیحدہ' لیکن چونکہ عربی زبان میں انگریزی کی طرح علامتیں اور اوقاف نہیں ہیں لہٰذا یہ فرق اسلوبِ بیان اور مضمون کے سیاق و سباق پر غور کرنے ہی سے سمجھ میں آتا ہے۔ اسے یوں بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ جب ایک خطیب خطبہ شروع کرتا ہے تو اس کے سامنے اس کے جو سامعین و مخاطبین ہوتے ہیں' ان کے ذہنوں میں کچھ اشکالات' اعتراضات اور سوالات ہوتے ہیں۔ چنانچہ خطیب ان کی تردید سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتا ہے اور کہتا ہے "لَا" یعنی ہرگز نہیں! تمہارے خیالات غلط ہیں۔ تمہارے اشکالات باطل ہیں۔ تمہارے اعتراضات بے وزن ہیں ـــــ اور پھر اپنے موقف کو بیان کرنے سے قبل اپنے یقین و اذعان کے اظہار کے لئے کوئی قسم کھاتا ہے جس کے لئے لفظ "اُقْسِمُ" استعمال کرتا ہے' جیسے یہاں قسم کھائی گئی۔ یعنی "میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی"۔ گویا قیامت اتنی یقینی' اتنی حتمی اور اتنی قطعی ہے کہ میں اس کی قسم کھا رہا ہوں۔ اسی طرح دوسری آیت پڑھئے : "اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی"۔ یہ آغاز خود بتا رہا ہے کہ یہ انداز و اسلوب خطیبانہ ہے۔ جیسے ایک خطیب پہلے سے جانتا ہے کہ اس کے سامنے جو سامعین و حاضرین موجود ہیں اور اس کے جو مخاطبین ہیں' ان کے ذہنوں میں کیا کیا وسوسے' کیا کیا اشکالات اور کیا کیا اعتراضات ہیں' اور وہ کن کن وجوہ اور اسباب کی بنیاد پر قیامِ قیامت اور وقوعِ آخرت کو بالکل ناممکن اور بعید از قیاس سمجھ رہے ہیں۔ لہٰذا خطیب ان کے تمام اشکالات' اعتراضات اور وسوسوں کی نفی و تردید کے لئے لاءِ نفی سے اپنے خطبے کا آغاز کر رہا ہے۔

۱۔ قیامت کی قسم!

اور اب توجہ کو مرتکز کیجئے ان دو قسموں کے نفسِ مضمون پر ـــــ ان میں سے پہلی قسم ہے خود قیامت کے دن کی۔ گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ تمہارے ذہنوں میں شبہات و اشکالات ہیں' تمہارے دلوں میں وسوسے ہیں کہ دنیا کے آغاز سے لے کر قیامِ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسان کیسے دوبارہ اٹھائے جا سکیں گے اور انہیں دوبارہ کیسے زندہ کیا

جاسکے گا؟ پھر ان سب انسانوں کے جملہ اعمال و افعال اور وہ بھی جملہ تفصیلات کے ساتھ کہاں محفوظ ہوں گے؟ مزید برآں ان اعمال و افعال کی پشت پر کارفرما نیتیں اور ارادے کس کے علم میں ہوں گے؟ لہٰذا یہ محاسبہ اور جزا و سزا کا معاملہ کیسے ظہور پذیر ہو سکے گا؟ لیکن یہ وقوعِ قیامت اس قدر یقینی' قطعی اور حتمی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میں اس دن کی قسم کھاتا ہوں"۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس میں دلیل کونسی ہے؟ اس لئے کہ اگر کوئی شخص کوئی دعویٰ پیش کرے اور اس سے اس دعوے کے لئے کوئی دلیل طلب کی جائے تو جواب میں وہ اس پر صرف قسم کھانے پر اکتفا کرے تو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ عقلی اور منطقی اعتبار سے اس نے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اسلوب اور اصول میں بھی ایک دلیل مضمر ہے' اور وہ دلیل ہوتی ہے خود متکلّم کی شخصیت کی۔ اگر کوئی صاحبِ کردار انسان جس پر اعتماد کیا جاتا ہو' جس کی صداقت کی گواہی دی جاتی ہو' جب وہ کوئی بات کہتا اور قسم کھا کر کہتا ہے تو اس کے قسم کھانے سے اس کی بات میں نمایاں وزن پیدا ہو جاتا ہے جو درحقیقت اور اصلاً اس شخص کی اپنی شخصیت کا ہوتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ یہاں قسم کھانے والا کون ہے! ان لوگوں کے نزدیک جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام تسلیم کرتے ہیں' قسم کھانے والا خود اللہ ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کو اللہ کا کلام ماننے والے صاحب ایمان پر تو اس کا لازمی اثر یہ پڑے گا کہ اس کا دل لرز جائے گا اور وہ کانپ اٹھے گا کہ قیامت کا دن اتنا یقینی' حتمی اور قطعی ہے کہ خود خالق کون و مکاں نے اس کی قسم کھائی ہے۔

رہے وہ لوگ جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے تو وہ بھی اس قسم کو لامحالہ منسوب کریں گے جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی طرف۔ اور اس صورت میں بھی اس قسم کی تاثیر ختم نہیں ہو گی بلکہ باقی رہے گی' اس لئے کہ حضورؐ کی شخصیتِ مبارکہ اور سیرتِ مطہرہ کا وزن اس کی پشت پر پھر بھی موجود رہے گا کہ یہ قسم وہ کھا رہا ہے جس کی صداقت و امانت کی گواہی اس کے دشمنوں تک نے دی ہے۔ یہ مضمون اس سے قبل سورۃ التغابن کی آیت نمبر ۷ کے الفاظِ مبارکہ ﴿ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ﴾ "(اے نبیؐ) کہہ دیجئے : کیوں نہیں! اور مجھے میرے رب کی قسم ہے کہ تم

لازماً دوبارہ اٹھائے جاؤ گے اور پھر تم لازماً جتلا دیئے جاؤ گے جو کچھ تم (دنیا میں) کرتے رہے ہو" کی تشریح و توضیح کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔ چنانچہ سیرتِ مطہرہ کا اہم واقعہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ اور اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل سے یہ پوچھا گیا کہ "کیا تمہارا گمان یہ ہے کہ محمدؐ جھوٹ بولتے ہیں" تو اس نے کہا "ہرگز نہیں! انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا"۔ پھر جب پوچھنے والے نے پوچھا کہ "پھر تم ان کی تصدیق کیوں نہیں کرتے اور ان پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟" تو اس نے بڑی صفائی کے ساتھ اقرار کیا کہ "اصل معاملہ یہ ہے کہ ہمارے اور بنو ہاشم کے مابین ایک مسابقت اور مقابلہ جاری ہے۔ انہوں نے لوگوں کو کھانے کھلائے تو ہم نے ان سے بڑھ کر کھلائے' انہوں نے مہمان نوازیاں کیں تو ہم نے ان سے بڑھ کر کیں' ہم اب تک ان کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملائے چلے آ رہے ہیں۔ اب اگر ہم ان کے ایک فرد کی نبوت کو تسلیم کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم ہمیشہ کے لئے ان کے تابع ہو جائیں گے اور یہ بات مجھے کسی طور پر بھی گوارا نہیں"۔ معلوم ہوا کہ ابوجہل جیسا دشمنِ خدا و رسولؐ بھی حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ کا الزام نہیں لگا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضور ﷺ کو حکم ہوا : ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (الحجر : ۹۴) "پس اب (اے نبیؐ) آپؐ برملا اور ڈنکے کی چوٹ کہئے وہ بات جس کا آپؐ کو حکم ملا ہے" اور آپؐ پہلے "خطابِ عام" کے لئے کوہ صفا پر کھڑے ہوئے تو چونکہ اس زمانے میں رواج تھا کہ اگر کوئی اہم خبر لوگوں کو پہنچانی مقصود ہوتی تھی تو خبر پہنچانے والا کسی بلند مقام پر بے لباس ہو کر کھڑا ہو جاتا تھا اور نعرہ لگاتا تھا "وَاصَبَاحَا" (ہائے وہ صبح جو آنے والی ہے) چنانچہ لوگ اس کی آواز سن کر اور جن تک آواز نہیں پہنچتی تھی وہ دور سے یہ دیکھ کر کہ ایک "ڈرانے والا" پہاڑی پر کھڑا ہے' اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ لہٰذا حضور ﷺ نے اس رواج میں یہ ترمیم فرماتے ہوئے کہ کپڑے نہیں اتارے' اس لئے کہ یہ بات کسی طرح بھی آپؐ کے شایانِ شان نہ تھی اور آپؐ تو حیا کا پیکرِ اعظم تھے' باقی سارا معاملہ معمول کے مطابق کیا اور کوہ صفا پر کھڑے ہو کر بآوازِ بلند فرمایا : "وَاصَبَاحَا"۔ اور جب آپؐ کی یہ ندا سن کر اور آپؐ کو کوہ صفا پر کھڑا دیکھ کر لوگ آپؐ کے گرد جمع ہو گئے تو آپؐ نے دعوت پیش کرنے سے پہلے لوگوں سے سوال کیا "لوگو!

تم نے مجھے کیسا پایا؟" مجمع نے بیک زبان تسلیم کیا کہ آپؐ سچے بھی ہیں اور امانت دار بھی! لہٰذا جو لوگ قرآن مجید کو منزّل مِنَ اللہ نہیں مانتے اور ان کے نزدیک اس کلام کے متکلم خود محمد (ﷺ) ہیں' ان کے لئے حضورؐ کی شخصیت کا پورا وزن اور پورا زور اس قسم کی پشت پر موجود ہے کہ ﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ "کیوں نہیں! مجھے قسم ہے قیامت کے دن کی"۔ یعنی میں قیامت کے وقوع کو اتنا یقینی' قطعی اور حتمی مانتا ہوں کہ اس کے یقینی اور رشدنی ہونے پر خود اس ہی کی قسم کھاتا ہوں!

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے سورۃ التغابن کی آیت نمبر ۷ میں نبی اکرم ﷺ سے جو قسم کھلوائی گئی تھی اس کا بھی یہی مفاد اور انداز تھا۔ اصطلاح میں اس کو "دلیلِ خطابی" کہا جاتا ہے جس میں دلیل کی حیثیت متکلم کے اپنے یقین واثق اور اس کی اپنی بے داغ شخصیت اور اعلیٰ سیرت کو حاصل ہوتی ہے اور جس کے ذریعے متکلم کا یقین اور اذعان مخاطبین میں منتقل ہوتا اور سرایت کرتا ہے۔

۲۔ نفسِ ملامت گر کی قسم!

اب آیئے دوسری دلیل کی طرف۔ ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ "اور کیوں نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی"۔ اس بات کو ایک آفاقی و عالمی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ انسان کے باطن میں ایک حقیقت پوشیدہ ہے جسے ضمیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انسان جب کوئی برا کام کرتا ہے تو اسے اندر سے ضمیر کی خلش کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اس لئے کہ برے سے برا انسان بھی یہ جانتا ہے کہ برائی برائی ہے اور بدی بدی ہے' اور اگرچہ مختلف اسباب اور محرکات کے تحت وہ کسی برائی کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے' لیکن عین اُس وقت بھی وہ یہ جانتا ہے کہ یہ کام برا ہے اور اسے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اس کا ضمیر اسے اندر ہی اندر کچوکے دے رہا ہے۔

اسی احساس اور اسی کیفیت کو اس آیتِ مبارکہ میں "نفسِ لوّامہ" قرار دیا گیا ہے اور آیتِ مبارکہ میں اس کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس لئے کہ نفس انسانی کی یہ مضمر حقیقت

جو عالمی اور آفاقی سطح پر مسلم سچائی کی حیثیت رکھتی ہے' وقوع قیامت پر سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ مؤثر دلیل ہے۔' جسے قرآن حکیم نے اسلوب اور الفاظ کے فرق اور تنوع کے ساتھ بہت سے مقامات پر' کہیں اجمال اور کہیں تفصیل کے ساتھ' بیان کیا ہے۔

اس دلیل کا اگر کسی قدر تفصیلی تجزیہ کیا جائے تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے نیکی اور بدی کو پہچانتا ہے' ان میں تمیز کرتا اور ان کے فرق و تفاوت کو خوب جانتا اور پہچانتا ہے۔ گویا یہ پہچان اور یہ شعور فطرت انسانی میں ودیعت شدہ ہے۔ چنانچہ آخری پارہ کی سورۃ الشمس میں فرمایا گیا : ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ○﴾ "اور گواہ ہے نفس انسانی اور جیسا کہ اسے بنایا اور سنوارا' پھر اس میں فجور و تقویٰ (برائی اور اچھائی اور بدی اور نیکی کا علم) الہامی طور پر ودیعت کر دیا"۔ چنانچہ ہر شخص جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا برائی ہے اور سچ بولنا اچھائی ہے' وعدہ خلافی برائی ہے اور ایفائے عہد بھلائی ہے' کسی کو دھوکہ دینا شر ہے اور کسی کی صحیح رہنمائی کرنا خیر ہے' ظلم و استحصال اور تعدّی و حق تلفی بدی کے کام ہیں' جبکہ عدل و انصاف' ہمدردی و خیر خواہی اور خدمتِ خلق نیکی کے کام ہیں۔ یہ سب عالمی اور آفاقی سچائیاں ہیں اور ان کے ضمن میں کہیں بھی انسانوں کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اب اگر یہ حقیقت ہے' جیسی کہ وہ فی الواقع ہے' اس لئے کہ اس کے حقیقت ہونے پر سب سے بڑا گواہ ہے ہمارا اپنا ضمیر' ہمارا اپنا نفسِ ملامت گر اور ہمارا اپنا ذاتی احساس کہ اگر کسی سبب سے ہم سے کوئی غلط حرکت سرزد ہو جاتی ہے یا کسی برے کام کا ارتکاب ہو جاتا ہے تو ہمارا اپنا ضمیر ہمیں ملامت کرتا ہے کہ تم نے یہ برا کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان معدودے چند لوگوں کا معاملہ ذہن سے نکال دیجئے جن کی فطرت بالکل ہی مسخ ہو چکی ہو' جن کے دل پتھر بن گئے ہوں' جن کا ضمیر مُردہ ہو چکا ہو' جو اتنے کٹھور دل ہو چکے ہوں کہ انسانیت کی کوئی رمق بھی ان میں باقی نہ رہی ہو اور جن کی خود غرضی اور مفاد پرستی جملہ اخلاقی اقدار پر مسلط ہو چکی ہو۔ ان لوگوں کی حیثیت ان استثنا آت کی ہے جو قواعد و کلیات کو مزید ثابت اور مؤکّد کرتے ہیں۔ ورنہ قاعدہ کلیہ یہی ہے کہ فطرتِ

انسانی نیکی اور بدی اور خیر و شر کے مابین واضح طور پر فرق اور تمیز کرتی ہے۔ فطرتِ انسانی کی اس بدیہی حقیقت پر اگر عقل سلیم کے اس مسلّمہ اصول کا اطلاق کیا جائے کہ ع "گندم از گندم بروید' جو ز جو!" تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو نیک اعمال کا اچھا صلہ ملنا چاہئے اور بداعمالیوں کی سزا ملنی چاہئے' جبکہ فی الواقع جو صورت ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں نیکی کا بدلہ بھلائی کی صورت میں اکثر و بیشتر تو بالکل ملتا ہی نہیں اور اگر ملے بھی تو نیکی کی مناسبت سے نہیں ملتا۔ اسی طرح بدی کی سزا اکثر و بیشتر تو ملتی ہی نہیں۔ اگر ملتی بھی ہے تو جرم کے تناسب کے ساتھ نہیں ملتی۔ مثلاً ہٹلر کا نام ذہن میں لایئے جس کی ہوس اقتدار اور جوع الارض کی وجہ سے لاکھوں انسان مارے گئے' لاکھوں خواتین بیوہ ہوئیں' کروڑوں بچے یتیم ہو گئے' ہزاروں افراد اپاہج ہو گئے' لاکھوں گھر تباہ و برباد ہو گئے اور ان کے مکین بے خانماں ہو گئے۔ نوعِ انسانی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کتنا بڑا اور ہولناک جانی و مالی نقصان نوعِ بشر کو مجموعی طور پر ہٹلر کی ہوسِ ملک گیری اور نسلی برتری کے زعم باطل کے باعث پہنچا۔ اب اگر ہٹلر گرفتار ہو جاتا اور اس کے جسم کا ایک ایک ریزہ بھی کر دیا جاتا تو کیا اسے اپنے جرائم کی پوری سزا مل جاتی؟ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ایک گولی سے خود اپنی زندگی ختم کر لی اور وہ اپنے جرائم کی دنیوی سزا سے بالکل بچ گیا۔ معلوم ہوا کہ اس اعتبار سے یہ دنیا ناقص ہے۔ یہاں قوانینِ طبعیہ تو پورے طور پر بروئے کار آ رہے ہیں' آپ اگر آگ میں انگلی ڈالتے ہیں تو وہ جل جاتی ہے' آپ کوئی سم قاتل اور زہر ہلاہل کھائیں گے تو مر جائیں گے' لیکن لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو کوئی گزند نہیں پہنچتا' زبان پر چھالا تک نہیں پڑتا' لوگ حرام خوریاں کرتے ہیں تو سب رچ پچ جاتا ہے' کسی نوع کے دردِ شکم تک سے سابقہ پیش نہیں آتا' لوگ حق تلفیاں کرتے ہیں' رشوتیں لیتے دیتے ہیں' جبر و استحصال اور ناجائز ذرائع سے دولت جمع کرتے ہیں تو اس طرح جو جتنا مالدار اور دولت مند ہوتا ہے' معاشرے میں اس کی اسی اعتبار سے عزت بڑھتی چلی جاتی ہے' حالانکہ اکثر لوگ جانتے ہیں کہ اس کی دولت مندی اور مالداری کی حقیقت کیا ہے اور کن ناجائز ذرائع سے اس نے دولت حاصل کی ہے۔ الغرض ایسے لوگ دنیا میں گلچھرے اڑاتے ہیں' عیش کرتے ہیں' آسودہ حال رہتے ہیں'

صاحبِ عزّت و شرف سمجھے جاتے ہیں جن کے کوئی اصول نہیں ہیں' جو جائز و ناجائز' حرام و حلال اور خیر و شر کی تمیز اور اس بات کا رتی بھر لحاظ رکھے بغیر کہ ان کے اس طرزِ عمل سے قومی و ملی مفادات اور ملکی معیشت کو کتنا مہلک نقصان پہنچ رہا ہے' ہر نوع کی جعل سازی سے دن رات دولت سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے لوگوں کے لئے زندگی کی ناگزیر ضروریات فراہم کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے جو جائز اور ناجائز میں امتیاز کریں' حلال اور حرام میں فرق کریں' صحیح اور غلط کا لحاظ رکھیں اور اخلاق کی اعلیٰ اقدار کا پاس کریں۔

اب یا تو یہ مانا جائے کہ یہ دنیا نری اندھیر نگری اور چوپٹ راج ہے اور یہ تخلیق عبث اور بے مقصد ہے' ورنہ ایک دوسری زندگی کو ماننا لازم ٹھہرے گا' جس میں جزا و سزا کا قانون بھرپور طور پر بروئے کار آئے۔ یاد ہو گا کہ بالکل یہی بات سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کے مطالعہ کے دوران ہمارے سامنے آچکی ہے کہ ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا' سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝﴾ یعنی "اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد' بے کار اور عبث پیدا نہیں کیا۔ تو اس سے پاک اور اعلیٰ و ارفع اور منزّہ و مبرّا ہے (کہ کوئی کام بے کار و بے مقصد کرے! تیری تخلیق کا یہ محکم نظام اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ نیکی کی جزا اور بدی کی سزا ملے گی۔) پس (اے ہمارے رب) ہمیں آگ کے عذاب سے بچائیو!" لہٰذا عقل و منطق کی رو سے بدیہی طور پر لازم آتا ہے کہ اگر خیر خیر ہے' شر شر ہے' نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے تو ایک دوسری زندگی لازماً ہونی چاہئے جس میں ان اعمال کے پورے نتائج ظاہر ہوں' نیکی کا بھرپور صلہ اور پورا پورا بدلہ ملے اور بدی کی بھرپور سزا ملے۔ الغرض یہ ہے قرآن حکیم کا بدیہیاتِ فطرت پر مبنی استدلال جو وہ ع "اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں" کے مصداق مختلف اسالیب سے متعدد مقامات پر' کہیں تفصیل کے ساتھ اور کہیں اجمال کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ مثلاً سورۃ القلم میں ارشاد فرمایا گیا ﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝﴾ یعنی سوچو تو سہی' کیا ہم اپنے فرماں برداروں اور مجرموں کو برابر کر دیں گے؟ کیا تم لوگوں کی مت ماری گئی ہے کہ ایسا

حکم لگاتے ہو؟ ـــــ اگر واقعتاً کوئی اور زندگی نہیں ہے اور نہ کوئی آخرت ہے نہ محاسبہ' نہ جزا و سزا تو مجرم اور باغی تو مزے میں رہے کہ انہوں نے دنیا میں اس پر عمل کیا کہ ع "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"۔ گویا عقلی اور منطقی طور پر ان لوگوں کی روش زیادہ درست اور مناسب ہے جنہوں نے خیر و شر کے مابین کوئی امتیاز نہیں کیا' جنہوں نے جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے درمیان کوئی تمیز نہیں کی۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر خود ہماری عقل تقاضا کرتی ہے کہ دوسری زندگی ہونی چاہئے جس میں انسان کو اپنے اعمال کی بھرپور جزا یا پوری پوری سزا مل جائے۔

بہرحال یہ ہے خلاصہ اس پورے استدلال کا جس کو یہاں پر صرف ایک قسم کے اسلوب سے پیش کیا گیا ہے : ﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ "اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی"۔ یہاں ذرا وہ بات بھی ذہن نشین کر لیجئے جو سورۃ العصر کے سبق کے ضمن میں عرض کی گئی تھی کہ قسم کا اصل مقصد گواہی اور شہادت ہے۔ گویا وقوعِ قیامت پر ایک تو خود یومِ قیامت گواہ ہے' گویا "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" اور اگر وقوعِ قیامت پر کوئی اضافی گواہی مطلوب ہی ہے تو تمہارا اپنا ضمیر' تمہارا اپنا نفسِ ملامت گر گواہی دے رہا ہے کہ نیکی نیکی ہے' بدی بدی ہے' لہٰذا اس کا بھرپور بدلہ جزا یا سزا کی صورت میں ملنا چاہئے جو اس دنیا میں نہیں ملتا۔ چنانچہ اس کے لئے ایک دوسرا عالم ہونا عین عقل کا تقاضا ہے۔

مناسب ہو گا کہ اس مقام پر اس شخص کا حوالہ بھی دے دیا جائے جسے جدید مغربی فلسفے کا باوا آدم قرار دیا جاتا ہے' یعنی کانٹ' جس نے اپنے فلسفہ میں اخلاقی قانون کو بڑی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی پہلی کتاب "تنقیدِ عقلِ خالص" (Critique of Pure Reason) میں تو یہ ثابت کیا تھا کہ وجودِ باری تعالیٰ کو کسی منطقی دلیل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن پھر اپنی دوسری کتاب "تنقیدِ حکمتِ عملی" (Critique of Practical Reason) میں یہ بات ثابت کی کہ وجودِ باری تعالیٰ کے اثبات پر سب سے بڑی دلیل انسان کے اندر کا اخلاقی قانون ہے جو اس کے باطن اور اس کی فطرت میں ودیعت شدہ موجود ہے۔ یہ خیر و شر اور نیکی و بدی کی تمیز کہاں سے آئی؟

خالص مادے میں یہ شعور کیسے پیدا ہو گیا؟ انسان کے سوا حیوانات میں یہ شعور موجود نہیں ہے۔ حیوانات صرف جبلّت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ انسان کی شان ہے کہ وہ اخلاقی شعور رکھتا ہے اور خیر کی قدر و قیمت کو جانتا ہے اور بدی اور شر سے طبعاً نفرت کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ خدا کی ہستی پر دو دلیلیں سب سے زیادہ قوی ہیں۔ ایک تو ہمارے اوپر یہ ستاروں بھرا آسمان خدا کی ایک عظیم نشانی ہے اور دوسری نشانی وہ اخلاقی قانون و شعور ہے جو فطرتِ انسانی میں مضمر اور ودیعت شدہ ہے۔ واضح رہے کہ کانٹ نے اخلاقی قانون کو اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات کے لئے بطورِ دلیل استعمال کیا ہے' جبکہ قرآن مجید وقوعِ قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔

منکرینِ آخرت پر ردّ و قدح

سورۃ القیامہ کی ابتدائی دو آیات میں وارد شدہ قسموں کے بعد' جن کے بارے میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ان میں اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کے لئے قرآن مجید کا مثبت استدلال جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے' منکرینِ آخرت کے اعتراضات اور شبہات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا گیا :

﴿اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ لَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝﴾

"کیا انسان کا خیال یہ ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کر سکیں گے؟"

پھر فرمایا :

﴿بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ۝﴾

"کیوں نہیں! ہم قادر ہیں اس پر کہ اس (انسان) کی ایک ایک پور کو برابر اور درست کر دیں۔"

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' اس اسلوب میں اصل وزن متکلّم کی شخصیت کا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ بات کون کہہ رہا ہے! پھر یہ کہ وہ کس یقین سے کہہ رہا ہے اور کس اذعانی کیفیت کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ یقیناً ہم کو اس پر کامل قدرت حاصل ہے کہ ہڈیاں تو ہڈیاں ہم

انسان کی انگلیوں کی ایک ایک پور اور اس کے ایک ایک ریشے کو درست کر دیں اور از سرِ نو بنا دیں۔ بظاہر تو یہ صرف ایک دلیلِ خطابی ہے' لیکن غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اس میں ایک عقلی اور منطقی دلیل بھی مضمر ہے۔ اور وہ یہ کہ مخاطب اس بات پر غور کرے کہ آیا وہ اللہ کو بھی مانتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ اللہ ہی کو نہیں مانتا تو اس سے بعث بعد الموت اور قیامت و آخرت کے بارے میں گفتگو بے کار اور لاحاصل ہے۔ ایسے شخص سے تو پہلے وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں گفتگو ہو گی۔ لیکن اگر وہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کو مانتا ہے تو سوال یہ پیدا ہو گا کہ کیا وہ اللہ کو ہر چیز پر قادر مانتا ہے؟ اگر اس نے اللہ کو "القدیر" اور "القادر" مانا ہے تو اب اس کا اعتراض از خود ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اللہ ہر چیز پر قادر ہے' تو پھر تمہارا اعتراض کس بات پر ہے؟ تمہارے تمام شکوک و شبہات کے غبارے کی ہوا تو اللہ کو قادرِ مطلق تسلیم کرنے کے بعد خود بخود نکل جاتی ہے' اس لئے کہ جو ہستی ہر چیز پر قادر ہے' وہی ہے جو مُردوں کو دوبارہ زندہ کر سکے گی۔

دوسری دلیل انسان کے مشاہدات سے دی گئی ہے۔ یہ دلیل اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیات (از ۳۶ تا ۴۰) میں وارد ہوئی ہے جہاں اس استفہامِ انکاری کے بعد کہ "کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟" انسان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ ذرا اپنی تخلیق کے اس حصہ پر غور کرے جو اس کے علم میں ہے' یعنی رحمِ مادر میں جنین کے ارتقائی مراحل جن سے اللہ کی قدرت کاملہ اور اس کی تخلیقی قوتوں کا کسی درجے میں اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہر انسان جانتا ہے کہ اس کا آغاز ایک گندے پانی کی بوند سے ہوا۔ پھر اس نے ایک لوتھڑے کی شکل اختیار کی۔ پھر اسی لوتھڑے کے اندر سے یہ تمام اعضاء و جوارح' یہ سماعت و بصارت' یہ شعور و ادراک' یہ عقل و فہم' یہ غور و فکر کی استعداد اور حسّی معلومات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت' الغرض انسان کی حیران کن مشینری وجود میں آئی' اور اس کی تخلیق بھی ہوئی اور تسویہ بھی ہوا' اور اس کی نوک پلک سنواری گئی۔ مزید برآں اسی گندے پانی کی بوند سے کسی کو مرد بنا دیا کسی کو عورت' حالانکہ کوئی بڑی سے بڑی خوردبین بھی یہ فرق نہیں کر سکتی کہ رحم مادر میں نشو و نما پانے والا "نطفۂ امشاج" یعنی مرد کے نطفہ اور عورت کے بیضہ کے اتحاد و امتزاج

سے وجود میں آنے والا واحد خلیہ نر ہے یا مادہ۔ پھر ذرا انسان غور کرے کہ مرد اور عورت کا جسمانی نظام ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہے' اور اس پر بھی مستزاد ان کی نفسیاتی ساخت اور میلانات و رجحانات کے مابین کتنا فرق و تفاوت ہے! اور یہ سب کچھ اس گندے پانی کی بوند سے تخلیق کیا گیا ہے جس کا نام زبان پر لانا بھی کوئی شائستہ اور مہذّب انسان پسند نہیں کرتا۔ اللہ کی یہ ساری خلّاقی تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ اس سب کے باوجود بھی تمہیں یہ وسوسہ لاحق رہتا ہے اور تم یہ اعتراض کرتے ہو کہ انسان کے مرجانے اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جانے' یا جل کر راکھ ہو جانے یا کسی درندے یا مچھلی کی غذا بن جانے کے بعد اسے دوبارہ کیسے اٹھایا جا سکتا ہے! اور کیسے دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا وہ اللہ جس کی خلّاقی کا یہ عالم ہے کہ وہ گندے پانی کی ایک بوند سے انسان جیسی اشرف المخلوقات ہستی تخلیق فرما دیتا ہے اس پر قادر نہیں ہو گا کہ مُردوں کو دوبارہ زندہ کر سکے!! چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

﴿ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی ○ اَلَمْ یَکُ نُطْفَۃً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ○ ثُمَّ کَانَ عَلَقَۃً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ○ فَجَعَلَ مِنْہُ الزَّوْجَیْنِ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی ○ اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی ○ ﴾

"کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس کو (بلا باز پرس) یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا (ابتداء میں) وہ منی کا ایک قطرہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا گیا تھا؟ پھر وہ خون کا ایک لوتھڑا بنا۔ پھر (اللہ نے اس کو انسان کی شکل میں) تخلیق فرمایا۔ پھر اس کا تسویہ فرمایا (اس کی نوک پلک سنواری)۔ پھر اس سے مرد اور عورت کی دو جنسیں بنائیں۔ کیا وہ ہستی اس پر قادر نہیں ہے کہ مُردوں کو زندہ کر سکے؟"

الغرض یہ ہے وہ انسان کے مشاہدے پر مبنی منطقی دلیل جو منکرین قیامت کے وسوسے اور ان کے استبعاد کا قطعی ابطال کر دیتی ہے اور ان کے جملہ اعتراضات کی نفی کر دیتی ہے۔

واضح رہے کہ اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کا مثبت استدلال تو وہ تھا جو اس

سورۂ مبارکہ کے آغاز میں وارد شدہ دو قسموں میں سے دوسری قسم میں اجمال کے ساتھ بیان کر دیا گیا تھا کہ انسان کا ضمیر یا نفسِ لوّامہ شاہد ہے کہ فطرتِ انسانی نیکی اور بدی میں امتیاز کرتی ہے۔ اب ایک جانب عقل انسانی مطالبہ کرتی ہے کہ ع "گندم از گندم بروید' جوز جو!" کے مطابق نیکی کی بھرپور جزا اور بدی کی پوری پوری سزا ملنی چاہئے' اور دوسری جانب مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں فی الواقع ایسا نہیں ہو رہا' بلکہ بسا اوقات معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ دنیا ناقص ہے' چنانچہ ایک دوسری زندگی ہونی چاہئے جس میں نیکی اور بدی کا بھرپور بدلہ ملے۔ عقل کے اس مطالبے اور فطرت کے اس تقاضے کے مقابلے میں منکرینِ آخرت و قیامت کی جانب سے صرف ایک منفی دلیل پیش کی گئی۔ یعنی صرف یہ استبعاد اور استعجاب کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب انسان مٹی ہو کر مٹی میں مل جائے اور اس کی ہڈیاں بھی گل سڑ جائیں تو اسے دوبارہ اٹھا لیا جائے۔

اس کا ایک جواب تو خطابی انداز میں دیا گیا کہ : ﴿بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ﴾ یعنی "کیوں نہیں! ہم تو اس کی انگلیوں کی پوروں تک کو درست کرنے پر قادر ہیں"۔ جس میں یہ منطقی دلیل بھی مضمر ہے کہ جب تم اللہ کو مانتے ہو اور اسے ہر چیز پر قادر جانتے ہو تو اب تمہارے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی' اور دوسرا جواب انسان کی رحمِ مادر میں جنین کی حیثیت سے تخلیق کے حوالے سے دیا گیا۔ کس کے لئے ممکن ہے کہ اس ہستی کی قدرت اور تخلیقی قوت کا اندازہ کر سکے جو ایک گندے پانی کی بوند سے انسان جیسی عظیم مخلوق پیدا فرما دیتا ہے۔ کیا وہ قادرِ مطلق تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہ کر سکے گا؟ ظاہر بات ہے کہ اس سوال کا جواب ہر سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان اثبات میں دے گا۔ چنانچہ یہی بات ہمیں نبی اکرم ﷺ نے اس طرح تلقین فرمائی کہ آپؐ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپؐ اس سورۃ کے اختتام کے بعد فرمایا کرتے تھے : بلٰی وربّنا کیوں نہیں! اے ہمارے رب' ہم اس پر گواہ ہیں کہ تو مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔

انکارِ آخرت کے اسباب

اس سورۂ مبارکہ میں دوسرا اہم مضمون یہ سامنے آیا کہ اگر منکرین کا یہ اعتراض منطق اور عقل کی رُو سے بالکلیہ باطل اور قطعاً بے وزن ہے تو پھر ان کے انکار کا اصل سبب کیا ہے اور یہ قیامت و آخرت کے منکر کیوں ہیں' اس کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ اس کے تین نہایت اہم اور بنیادی سبب بیان کئے گئے۔

۱۔ فسق و فجور کی عادت : اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ جب انسان فسق و فجور کا عادی ہو جاتا ہے اور اسے حرام خوری کی عادت پڑ جاتی ہے اور وہ حرام کی کمائی سے حاصل ہونے والی عیش کا خوگر ہو جاتا ہے اور لذّت کوشی اس کی گھٹی میں رچ بس جاتی ہے تو ان سب کا چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ اب اگر وہ آخرت کو مانے تو اسے حلال و حرام میں تمیز کرنی پڑے گی اور جائز و ناجائز کے فرق کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ چنانچہ جس طرح کبوتر جب بلی کو دیکھتا ہے تو اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے (حالانکہ اس طرح سے بلّی معدوم نہیں ہو جاتی) اسی طرح وہ لوگ جو فسق و فجور کے عادی ہو چکے ہیں اور اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں' بلکہ اس کو جاری رکھنا چاہتے ہیں' وہ آخرت ہی کا انکار کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے اسی میں عافیت سمجھی ہے کہ روایتی کبوتر کی مانند قیامت و آخرت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ گویا منکرین قیامت و آخرت کے انکار کا اصل سبب منطقی ہے نہ عقلی' بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی حرام خوری اور فسق و فجور کی روش اور لاابالیانہ طرزِ زندگی کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ نہایت جامع الفاظ میں ارشاد فرمایا : ﴿بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ۝﴾ یعنی ان کے اعراض و انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی فسق و فجور کی روش کو جاری رکھنا چاہتے ہیں!

۲۔ دنیا کی محبت : آخرت اور قیامت کے انکار کا دوسرا سبب دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا :

﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۝﴾

"ہرگز نہیں! بلکہ تم لوگ عاجلہ سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو!"

یعنی تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ تم عاجلہ کی محبت میں گرفتار ہو' اور اس کے پرستار بن گئے ہو۔ لفظ "عاجلہ" عجلت سے بنا ہے' اس سے مراد "دنیا" ہے۔ اس لئے کہ اس کا نفع بھی فوری اور نقد ہے اور نقصان بھی فوری اور نقد ہے۔ اس کی لذتیں بھی بالفعل محسوس ہوتی ہیں اور اس کی کلفتیں بھی فوری اثر کرنے والی ہوتی ہیں۔ تم اس عاجلہ سے دل لگائے ہوئے ہو اور آخرت کی زندگی کو نظرانداز اور فراموش کئے ہوئے ہو۔ یہاں عاجلہ کا لفظ استعمال کر کے اس حقیقت کی جانب توجّہ مبذول کرادی گئی کہ اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ فوری لذتوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور فوری آسائشوں کو قربان نہیں کر سکتے' وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس کے برعکس جنہیں آگے بڑھنا ہوتا ہے اور جو دوراندیش اور دوربین ہوتے ہیں وہ فوری راحت و آرام کو تج دیتے ہیں اور سخت محنت کرتے ہیں یہاں تک کہ راتوں کو جاگتے ہیں تا کہ اپنے دنیوی کیریئر کو روشن بنا سکیں۔ بالکل اسی طرح جو لوگ دنیا کی فوری لذت اور عیش و راحت کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے' جو اس عاجلہ (دنیا) کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور اس عروسِ ہزار داماد کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں' جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ آخرت سے غافل رہتے ہیں اور اللہ کی جناب میں محاسبہ کے لئے کھڑے ہونے کو فراموش کر دیتے ہیں' وہ اخروی زندگی میں لامحالہ ناکام اور خائب و خاسر ہو کر رہیں گے۔
لیکن افسوس کہ انسان مختصر سی حیات دنیوی میں تو مستقبل سے غافل نہیں ہوتا' لیکن آخرت کی ابدی زندگی سے غافل رہتا ہے اور حیات دنیوی کو اس انداز سے بسر کر دیتا ہے کہ ؎

اب تو آرام سے گزرتی ہے
آخرت کی خبر خدا جانے!

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دو حکیمانہ اشعار میں دنیا میں کامیابی اور ناکامی کا نقشہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچ دیا ہے کہ ؎

یَغُوص البحرَ مَن طلَب اللّئَالی
ومَن طلَبَ العلٰی سَہِرَ اللّیالی

وَمَن طَلَبَ العُلٰی مِن غَیرِ کَدٍّ
اضاعَ العُمرَ فی طَلَبِ المُحالِی

"جو موتیوں کا طالب ہوتا ہے لامحالہ سمندر میں غوطے لگاتا ہے۔ اور جو بلند مقام حاصل کرنا چاہتا ہے وہ راتوں کو جاگتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص بغیر محنت و مشقت کے بلند مقام و مرتبہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اپنی عمر ناممکن چیز کی خواہش میں ضائع کر دیتا ہے۔"

گویا بقول حالی مرحوم ؎

تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی!

افسوس کہ دنیا میں ایسے انسان تو پھر بھی بہت سے مل جاتے ہیں جو دنیا کے حصول کے لئے محنت و مشقت بھی کرتے ہیں اور راحت و آرام کو بھی تج دیتے ہیں' لیکن آخرت کی کامیابی کے حصول کے لئے اس طرز عمل کے اختیار کرنے والے بہت ہی کم ہیں!

۳۔ **تکبّر و تمرّد** : اس سورۂ مبارکہ میں انکارِ قیامت و آخرت کا جو تیسرا اہم سبب بیان کیا گیا ہے' وہ تکبّر ہے۔ ارشاد فرمایا گیا :

﴿ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ۝ وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۝ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰی اَهْلِهٖ یَتَمَطّٰی ۝ ﴾

"پس اس نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز ادا کی۔ بلکہ جھٹلایا اور روگردانی کی۔ پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا۔"

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ تابعین کرامؒ میں سے جن حضرات کو تفسیر قرآن سے خصوصی شغف تھا' وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ الفاظ عام ہیں اور ان میں ایک عام متکبر انسان کی نقشہ کشی کی گئی ہے' لیکن یہاں معیّن طور پر ابوجہل مراد ہے۔ یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ ابوجہل کے اعراض و انکار اور کفر و تکذیب کا سب سے بڑا سبب تکبّر تھا۔ وہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے نیچا ہونے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اسی لئے اس نے تصدیق نہیں کی۔ "فَلَا صَدَّقَ" میں اس کی اسی روش کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ حضورؐ کی تصدیق کرتا

جو خبر دے رہے تھے وقوع قیامت کی اور جو مدّعی تھے اللہ کے نبی اور رسول ہونے کے' تو آپؐ کی تصدیق کے لازمی معنی یہ ہوتے کہ وہ آپؐ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا اور آپؐ کی اطاعتِ کلی قبول کرتا ہے' اور اس کے لئے اس کی متکبّرانہ طبیعت آمادہ نہیں تھی۔ اسی طرح جو شخص نماز پڑھتا ہے وہ ہمہ تن اللہ کے سامنے جھکتا ہے' جس کا نقطۂ آغاز ہے ادب کے ساتھ جھک کر کھڑے ہونا' اور پھر درمیانی مقام ہے حالتِ رکوع' اور اس کی انتہا ہے حالتِ سجدہ۔ اب بہت سے انسان اتنے سرکش اور متمرد ہوتے ہیں کہ ان کی اکڑی ہوئی گردنیں اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جھکنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔ الغرض تصدیق اور نماز کی راہ میں رکاوٹ اور انکار و تکذیب پر آمادہ کرنے والی اہم چیز ہے تکبر و تمرد' جس کا نقشہ کھینچ دیا گیا ان الفاظ مبارکہ سے کہ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ○ "پھر وہ چل دیا اپنے گھر والوں کی جانب اکڑتا اور اینٹھتا ہوا!"

تین ہولناک مناظر کی نقشہ کشی

اب اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کے تیسرے اہم حصے کی جانب توجہ منعطف کیجئے جو تین مواقع کی منظر کشی پر مشتمل ہے' جن کی ایسی کامل تصویر لفظی پیش کر دی گئی ہے کہ ہوں کے سامنے پورا نقشہ آجاتا ہے۔ چنانچہ ایک نقشہ ہے "السَّاعَة" کا' یعنی وہ بڑی ہل چل جو اس کائنات کے نظام میں آنے والی ہے' جس کے بارے میں سورۃ الحج میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ﴾ یعنی "لوگو! اپنے پروردگار اور اپنے آقا کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو' اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ "السَّاعَة" کا زلزلہ بڑی خوفناک چیز اور بہت ہولناک واقعہ ہو گا!"۔ یہ قیامت کی آمد کا پہلا نقشہ ہے جسے قرآن مجید یہاں "السَّاعَة" سے موسوم کرتا ہے۔ اسی کو دوسرے مقامات پر القَارِعَة' الحَاقَّة' الطَّاغِية' الصَّاخَّة اور الطَّامَّة الکبریٰ بھی فرمایا گیا۔ اس "السَّاعَة" کا نقشہ اس سورۂ مبارکہ میں یوں کھینچا گیا:

﴿ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ○ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ○ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ○ ﴾

"جب نگاہ چندھیا جائے گی۔ چاند بے نور ہو جائے گا اور سورج اور چاند ایک کر دیئے جائیں گے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ کششِ ثقل کا جو باہمی نظام ہے' اس کا معاملہ درہم برہم ہو جائے گا اور یہ بڑے بڑے کُرے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائیں گے اور چاند سورج میں دھنس جائے گا۔ تو یہ اس السَّاعَۃ کے ابتدائی احوال ہیں۔ جب یہ کیفیت نظر آئے گی تو یہی انسان جو اس وقت اکڑ رہا ہے' بڑے متکبرانہ انداز میں چیلنج کر رہا ہے کہ : ﴿ يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ ○ ﴾ "(تحدی کے ساتھ) پوچھتا ہے کہ کب ہو گا قیامت کا دن؟" اس روز اس کا یہ حال ہو گا کہ : ﴿ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ○ ﴾

"یہ انسان کہہ رہا ہو گا کہ ہے کوئی جائے فرار؟ ہے کوئی پناہ گاہ؟ جواباً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہو رہا ہے"۔

﴿ كَلَّا لَا وَزَرَ ○ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ نِ الْمُسْتَقَرُّ ○ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ○ ﴾

"ہرگز نہیں! اس روز کوئی جائے پناہ نہیں ہو گی۔ اس روز تو تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہو گا۔ اس روز انسان کو جتلا دیا جائے گا جو کچھ اس نے آگے کیا (یا آگے بھیجا) اور جو کچھ پیچھے کیا (یا پیچھے چھوڑا)!"

یہ ایک نقشہ تو "السَّاعَۃ" کا ہے جو کھینچا گیا۔ دوسرا نقشہ ہے "یوم القیامۃ" کا ـــــ جس روز لوگ اپنے رب کے حضور میں کھڑے ہوں گے' نتیجہ کا اعلان ہونے والا ہو گا۔ جیسے کہ آپ نے اسکولوں میں دیکھا ہو گا کہ جس روز سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلتا ہے تو طالب علم جب کھڑے ہوتے ہیں تو نتیجہ گویا ان کے چہروں پر پہلے ہی سے لکھا ہوا ہوتا ہے۔ جو کامیاب ہونے والے ہوتے ہیں' جن کو معلوم ہے کہ ہم امتحان کے پرچے اچھے کر کے آئے ہیں' ان کے چہرے تر و تازہ ہوتے ہیں' انہیں کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ اور جنہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم فیل ہونے والے ہیں' وہ نتیجہ کے متعلق خود جانتے ہیں کہ وہ کیا ہو گا!

اسی کو اس سورۂ مبارکہ کی آیات ۱۴'۱۵ میں یوں فرمایا گیا :

﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ﴾

"ہر انسان کو خوب معلوم ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور وہ کہاں کھڑا ہے! خواہ وہ کتنے ہی بہانے تراشے' اور معذرتیں پیش کرے اور اپنی چرب زبانی سے اعتراض کرنے والوں کی زبانیں بند کر دے۔"

لیکن وہ اپنی تمام باطنی کیفیات اور اپنے اصل محرکاتِ عمل کو اچھی طرح جانتا ہے۔ لہٰذا جب وہ بارگاہ ربّ العزّت میں کھڑے ہوں گے تو ان کے چہروں پر ان کا انجام' ان کے امتحان کا نتیجہ لکھا ہوا ہو گا۔ اسی بات کو اگلی آیات (۲۲ تا ۲۵) میں فرمایا گیا : ﴿وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ ۙ اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ ۚ﴾ یعنی "اُس روز بہت سے چہرے ہوں گے تر و تازہ اور شاداں و فرحاں' اپنے پروردگار کی رحمت کے امیدوار' یا اپنے پروردگار کی جانب دیکھتے ہوئے"۔ اس کے برعکس کچھ لوگوں کا حال یہ ہو گا کہ ﴿وَوُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ بَاسِرَۃٌ ۙ تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِہَا فَاقِرَۃٌ ۚ﴾ "اور کچھ چہرے ہوں گے اس دن سوکھے ہوئے اور اداس' افسردہ و پریشان' اس خیال سے لرز رہے ہوں گے کہ اب ہمارے ساتھ کمر توڑ دینے والا سلوک ہونے والا ہے"۔

تیسرا نقشہ جو کھینچا گیا' وہ ہے قیامتِ صغریٰ یعنی عالمِ نزع کا نقشہ' جب اس دنیا سے روانگی کا وقت ہوتا ہے اور انسان کو یقین آ جاتا ہے کہ اب اپنے اہل و عیال اور مال و منال سے جدائی کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے : ((مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُہٗ)) "جو مر گیا اس کی قیامت تو واقع ہو گئی"۔ یعنی دنیا کی مہلتِ عمل ختم ہو گئی' جیسا کہ امتحان گاہ میں کہا جاتا ہے کہ وقت ختم ہو گیا' لکھنا بند کر دیا جائے اور قلم رکھ دیئے جائیں۔ تو یہ موت درحقیقت مہلتِ عمل کے خاتمے کا نام ہے اور وقوعِ جزا و سزا کا مقدمہ اور پیش خیمہ ہے۔ اُس وقت کا نقشہ کھینچا گیا : ﴿کَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ ۙ وَقِیْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۙ﴾ "ہرگز نہیں! جس روز کہ جان ہنسلیوں میں آن پھنسے گی اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا؟" ـــــ یعنی اب تو ساری تدبیریں ناکام ہو چکیں اور معالج جواب دے چکے۔ آپ نے دیکھا ہو گا اس موقع پر

بسا اوقات بڑے سے بڑا عقلیت پرست بھی اس تگ و دو میں لگ جاتا ہے کہ کوئی ٹونا ٹوٹکا ہی کام کر جائے اور کسی تیر تکے ہی سے کام چل جائے : ﴿وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝﴾ "اور یقین ہو جائے گا کہ اب جدائی کا وقت آن پہنچا ہے' اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹی ہو گی" ـــــ آخری آیت میں جو حالت بیان فرمائی گئی ہے وہ دنیا سے آخرت کی جانب انتقال (نقل مکانی) کے مختلف مراحل کی نہایت جامع اور فصیح و بلیغ تعبیر ہے یعنی : ﴿اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمَسَاقُ ۝﴾ (اُس روز کہا جائے گا) آج تو اپنے رب کی طرف ہی جانا ہے (چار و ناچار' کشاں کشاں)۔

الغرض یہ تین نقشے ہیں' جن کو پیش کرنے سے مطلوب و مقصود یہ ہے کہ جو لوگ آخرت اور قیامت کے منکر ہیں' جو کبوتر کی مانند اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں' جو اپنی فطرت کی گواہی پر غور نہیں کر رہے' اپنے ضمیر کی پکار کو نہیں سن رہے' اس کی خلش پر دھیان نہیں دے رہے' نفسِ ملامت گر کی پروا نہیں کر رہے' جو عقل و خرد اور فہم و ادراک نیز شعور سے کام نہیں لے رہے' ان کے باطن کی بصیرت شاید ان واقعات و حالات کی تذکیر سے جاگ جائے' جن کا وقوع پذیر ہونا یقینی' قطعی اور حتمی ہے' جیسا کہ سورۃ الذاریات میں فرمایا گیا : ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝﴾ "بلاشبہ تم سے جو وعدہ کیا جا رہا ہے وہ سچا ہے' حق ہے' اور یقیناً جزا و سزا واقع ہو کر رہے گی۔" گویا جو لوگ ان حقائق کو اپنے شعور و ادراک سے دور رکھے ہوئے ہیں اور ان کی طرف سے اپنی نگاہیں بند کئے ہوئے ہیں' اور جو خوابِ غفلت میں مدہوش ہیں' ان نیند کے متوالوں کو اس سورۂ مبارکہ میں مؤثر ترین اسالیب سے جگایا جا رہا ہے اور جو اس کے باوجود نہ جاگیں' بلکہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کئے رہیں ان کے لئے سورۂ مبارکہ کی آیات ۳۴' ۳۵ میں فرمایا : ﴿اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝﴾ "(اے غفلت شعار!) تیرے لئے افسوس اور ہلاکت ہے' اور پھر افسوس اور بربادی ہے!"

اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجامِ بد سے بچائے اور ہمارے دلوں میں آخرت کا یقین بھی پیدا فرما دے اور "زلزلۃ الساعۃ" اور "اھوال القیامۃ" کی سختیاں آسان فرما کر جنت الفردوس میں داخل فرمائے' آمین!

(جاری ہے)

شعروشاعری سے متعلق قرآن وسُنّت کا موقف

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی' لیکچرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

جزیرہ نمائے عرب میں جب اسلام کی شمع فروزاں ہوئی تو کفار و مشرکین مدہش و حیران رہ گئے اور ان کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگا۔ آخر ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ ظہور اسلام کی تاباں کرنوں سے ان کے موروثی دین کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا' ان کی کرسی و اقتدار پر مسلسل ضربیں پڑ رہی تھیں اور صدیوں سے تعمیر کیا ہوا قصر عظمت پیوند خاک ہو رہا تھا۔ لیکن سرفروشان حق کو خدا کی عظمت و بزرگی' رسول اکرم ﷺ کی قدم بوسی اور اپنی حیثیت کا احساس و ادراک منزل مقصود کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہا تھا۔ قرآنی تعلیمات دلوں کو جھنجھوڑ کر روحانی قوت کو بیدار کر رہی تھیں' شر و فساد کا قلع قمع کر کے خیر و فلاح کے بیج بوتی جا رہی تھیں اور ہر شعبہ زندگی میں بنی نوع انسان کی ظاہری اور باطنی تبدیلی و اصلاح کے لئے مہمیز کا کام کر رہی تھیں۔

فکر و نظر میں انقلاب برپا کرنے کے سلسلے میں قرآن پاک نے یہ تعلیم دی کہ دنیا میں دیگر جتنے مذاہب و نظریات پائے جا رہے ہیں وہ تمام مذہب اسلام کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں جبکہ اسلام ہی اللہ کا محبوب و پسندیدہ طریقہ زندگی ہے {۱}۔ جو لوگ اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب کو قبول کرتے ہیں ان کا مذہب یا طریقہ زندگی خدا کی بارگاہ میں شرف قبولیت سے ہمکنار نہیں ہو گا {۲}۔ اس نے اپنے ہی جیسے انسانوں کی تقدیس' معبودانِ باطل کی پرستش اور بعض دوسری مخلوقات کے خدائے بزرگ و برتر کی خدائی میں شرکت کے زعمِ باطل پر تیشہ چلا کر یہ دوٹوک انداز میں یہ واضح کر دیا کہ پوری کائنات کا مالک صرف ایک ذات ہے' وہی قادر مطلق ہے اور صرف اسی کی ذات پرستش کے قابل ہے۔ قرآن پاک نے ہی انسانیت کو یہ فکر ذہن نشین کرایا کہ اس عارضی زندگی کے بعد ایک مستقل اور ابدی زندگی بھی آنے والی ہے جہاں نیکو کاروں کو ان کے اعمال حسنہ کی جزا ملے گی' نیز بدکاروں اور شرپسندوں کو ان کی کرتوتوں کا بدلہ۔ پھر برتری و کمتری اور احسن و ارذل

کے باب میں قرآن نے واضح کر دیا کہ خدا کی نگاہ میں تم میں سے افضل و اکرم وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ خوف خدا رکھتا ہے {۳}۔

اخلاق و عادات کے ضمن میں قرآن کریم نے جو مبنی بر حکمت اور دلوں کو اپیل کرنے والی تعلیمات دی ہیں بلاشک و ریب اگر انہیں عملی جامہ پہنا دیا جائے تو ایک پر رونق' معزز اور انقلابی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ وحدت الٰہی' حیا و پاکدامنی' غضِّ بصر' عفو و درگزر اور عہد و امانت کے باب میں قرآن نے قیمتی اسباق دے کر بنی نوع انسان کو سیئات و منکرات کا باغی و معاند اور خیرات و حسنات کا حامی و محافظ بنا دیا۔ اس طرح اخلاق فاضلہ کو نشو و نما ملی اور اس وقت کا پورا معاشرہ جنت نشان بن گیا۔

آفتاب اسلام کے طلوع ہونے سے قبل حق و باطل' خیر و شر' جائز و ناجائز اور مستحسن و قبیح کے سلسلے میں مجموعی طور پر پوری انسانی برادری کا زاویہ فکر بدلا ہوا تھا۔ عرب کے معاشرے میں بالخصوص کفر و شرک اور الحاد و بے دینی کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ قبائلی اور گروہی تعصب نیز باہمی عداوت و رقابت کی بھٹیاں سلگ رہی تھیں۔ قبیلہ کے فخر و حماسہ میں جو جتنا زیادہ مبالغہ آرائی کرتا وہی قبیلے کا ہیرو سمجھا جاتا تھا اور آباء و اجداد کے شرف و عظمت کی تعریف و توصیف کو فرض منصبی قرار دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تمام محرکات و عوامل موجود تھے جن سے مطلق شعر گوئی کے فن کو عروج و اقبال کی منزل تک پہنچایا جا سکتا تھا۔ اور ہوا بھی یہی کہ شعر کو ہی تمام احوال و وقائع کی ترجمانی کا ذریعہ بنایا گیا۔ سیاسی معاملات ہوں یا معاشی معاملات' معاشرتی معاملات ہوں یا اخلاقی معاملات' رزم سے متعلق امور ہوں یا بزم سے متعلق معاملات' گویا کہ ہر شعبہ زندگی میں شاعری ہی عربوں کی زبان تھی۔ ابن سلام کہتے ہیں کہ اشعار زمانہ جاہلیت میں عربوں کے علم و حکمت کا دیوان کہے جاتے تھے {۴}۔

ابن قتیبہ عربوں کے نزدیک شعر کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدائے برتر نے قرآن کریم کو جو مقام و مرتبہ عنایت فرمایا ہے' عرب بعینہٖ وہی اہمیت شعر کو اہمیت دیتے تھے {۵}۔

ابن خلدون کی اس رائے میں موزونیت ہے کہ شعر عربوں کے نزدیک دوسرے

تمام کلاموں سے افضل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسے علوم و اخبار کا دیوان بنالیا تھا اور علم و حکمت کی بہت ساری چیزوں کو جاننے کے لئے وہ اس کی طرف رجوع کیا کرتے تھے اور اس میں پیش قدمی و مسابقت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے {۶}۔

تاریخ عرب میں اعشیٰ کے اس مدحیہ قصیدے کو عربی شاعری کا سرمایہ افتخار سمجھا جاتا ہے جس کے ذریعے محلق نامی شخص کی بچیوں کی شادی کا مسئلہ بہت آسانی سے حل ہو گیا {۷}۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اس کی سحر انگیز قوت اور عظمت و حشمت کی دلیل ہے' جس سے انکار و انحراف ایک تاریخی حقیقت سے اغماض اور چشم پوشی کے مترادف ہے۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ شعراء خاندان اور قبیلے کی زبان ہوتے تھے۔ شکست و ہزیمت' مصائب و مشکلات اور خطرات و حوادث میں انہیں ملجا و ماوی سمجھا جاتا تھا۔

چونکہ قرآن جاہلیت کی شب تاریک میں روشن قندیل بن کر نازل ہوا اور صاحب قرآن ﷺ بنی نوع انسان کے لئے بلند ترین اور انتہائی معیاری نصب العین لے کر اس مسموم و مکدر ماحول میں تشریف لائے اس لئے دوسرے شعبہ ہائے زندگی کے ساتھ ساتھ قرآن اور صاحب قرآن نے شعر و شاعری کی اس وسیع جولان گاہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور ہمہ گیر انقلاب کے پیامی کی حیثیت سے اس شعبہ زندگی کی طرف بھی التفات و توجہ کو امر ناگزیر قرار دیا۔ یہی نہیں بلکہ عملی پیش قدمی کر کے فن و ادب کو نئی جہتوں اور قابل ذکر وسعتوں سے ہمکنار کرایا اور دوسری طرف زاویہ فکر و نظر کو تبدیل کر کے شعراء کرام کو ایک خاص جہت سے اس میدان کا سرگرم اور فعال کارکن بنا دیا۔ بہرحال شعر و شاعری کی طرف توجہ دینا اور اسے فکر و فن کی مختلف جہتوں سے روشناس کرانا وقت کا اہم ترین تقاضا تھا جس سے بے اعتنائی برت کر ہمہ گیر انقلاب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا۔

نزول قرآن کے بعد جب مشرکین مکہ کی قوت فصاحت و بلاغت عاجز و درماندہ ہو گئی اور وہ دینی اور ثقافتی رسوم و روایات کو مخدوش و پر خطر محسوس کرنے لگے تو اضطراب و بے چینی کے عالم میں انہوں نے قرآن اور صاحب قرآن ﷺ پر افترا پردازیوں کی بوچھاڑ کو وظیفۂ حیات بنالیا۔ صاحب نبوت ﷺ کو اعلیٰ درجے کا شاعر اور وحی الٰہی کو

قصۂ پارینہ اور شاعری سے موسوم کر کے بعثت رسول کی تکذیب کو اپنی دلچسپیوں اور مصروفیتوں کا موضوع قرار دے لیا۔ قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ سے متعلق مشرکینِ مکہ کے اضطراب و بوکھلاہٹ کی کیفیت قابل ملاحظہ ہے :

﴿بَلْ قَالُوْا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ﴾

(الانبیاء : ۵)

"وہ کہتے ہیں : بلکہ یہ پراگندہ خواب ہیں' بلکہ یہ اس کی من گھڑت ہے' بلکہ یہ شخص شاعر ہے۔"

کفار و مشرکین کے اس اضمحلال و سراسیمگی کی کیفیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن کے نازل کرنے والے نے قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ کی عظمت ان الفاظ میں بتائی :

﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ (یٰسین : ۶۹)

"ہم نے اس (نبیؐ) کو شعر نہیں سکھایا ہے اور نہ شاعری اس کو زیب ہی دیتی ہے۔ یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف صاف پڑھی جانے والی کتاب۔"

علامہ ابن کثیر اس آیتِ کریمہ کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت پر ناطق ہے کہ شاعری نہ تو اس کی سرشت میں تھی' نہ اس کی فطرت اس کی مقتضی تھی اور نہ ہی ہم نے اسے شعر و شاعری کی تعلیم و تربیت دی۔ موصوف اسماعیل بن مجالد کے حوالے سے ابو زرعہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ سوائے رسول اکرم ﷺ کے عبدالمطلب کے پورے گھرانے کو شاعری کا ذوق تھا{۸}۔

ایک دوسری جگہ قرآن کریم سے متعلق کذب و بطلان پر مبنی مشرکین کے انتساب پر گرفت کی گئی :

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (الحاقہ : ۴۰-۴۱)

"یہ ایک رسول کریم کا قول ہے' کسی شاعر کا قول نہیں ہے' تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔"

آپ ﷺ رحمۃ للعالمین' مبشر اور منذر کی حیثیت سے نبوت کے جس منصبِ جلیل پر فائز تھے اس کا تقاضا تھا کہ دنیائے انسانیت کو صالح نظام زندگی سے متعارف کرایا جائے' کراہتی اور سسکتی ہوئی انسانیت کے سامنے نسخہ شفا پیش کیا جائے اور دونوں جہاں کی فلاح و کامیابی کے زریں اصول سے انہیں روشناس کرایا جائے۔ اس عظیم اور مقدس ترین مشن کا تعلق شعر و شاعری سے نہیں تھا' جہاں جذباتیت اور تخیل کلیدی حیثیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے لئے شاعری کو خلافِ شان اور منصبِ نبوت کے متضاد قرار دینے کی خدائی مصلحت بالکل عیاں ہو جاتی ہے جب شعراءِ جاہلیت سے متعلق یہ آیات کریمہ زیر مطالعہ ہوں :

﴿ وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُۥنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِىْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾

(الشعراء : ۲۲۴-۲۲۶)

"اور شعراء کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔"

ان فرموداتِ الٰہی میں شعراء کے لئے تین کسوٹیاں پیش کی گئی ہیں' جن کی روشنی میں شعراء کرام اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ دوسری طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف شاعری کا انتساب کرنے والوں کو ان آیاتِ بیّنات میں مُسکت جواب دیا گیا ہے۔

پہلی کسوٹی یہ فراہم کی گئی کہ شعراء چونکہ جذباتیت کی طوفانی لہروں میں غوطہ زن ہوتے ہیں' حقائق و معارف سے بڑھ کر تخیلات و توہمات کی مختلف وادیوں میں سرگرداں ہوتے ہیں' کلام میں زور استدلال' طلاقتِ لسانی' مبالغہ آرائی اور دوسری فنی خوبیوں کی بنیاد پر یقیناً مجمع کو اپنا ہمنوا بنا لینے کی صلاحیت ان میں ہوتی ہے لیکن وہی لوگ ان کی رفاقت و ہمنوائی اختیار کرتے اور تقلید و اتباع کا ثبوت دیتے ہیں جن کی فطرت میں کجی ہوتی ہے' جو حق و صداقت کے منکر و باغی ہوتے ہیں اور جو شاہراہ عدل و قسط سے دور ہو کر ضلالت و گمراہی اور طغیان و سرکشی کو شیوہ و شعار بنا لیتے ہیں [۹]۔ اس کے برعکس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مقدس مشن کی راہ میں سرگرم عمل ہیں۔ ایثار و خلوص' سنجیدگی اور

شائستگی اور صبر و استقلال کے دیو بن کر انسانیت کو صراط مستقیم دکھانے میں کوشاں ہیں اور وہی لوگ ان کے حلقہ بگوش ہو رہے ہیں جو فطرت صالحہ سے آراستہ ہوتے ہوئے جویائے حق ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔

دوسری کسوٹی یہ ہے کہ شعراء بالعموم کسی مخصوص مشن کے پیامی نہیں ہوتے اس لئے ان کی شاعری کسی مخصوص فکر کی غماز نہیں ہوتی۔ صحیح و غلط' مستحسن و قبیح اور حق و ناحق جیسے بہتیرے متضاد اوصاف سے ان کی شاعری مملوء ہوتی ہے۔ کسی مستقل نہج پر گامزن نہ ہوتے ہوئے افکار و خیالات اور توہمات و خرافات کی مختلف وادیوں میں سرگرداں ہوتے ہیں۔ وہ بھٹک رہے ہوتے ہیں اور اس طرح ان کی کوئی شناخت باقی نہیں رہتی۔ اس کے بالمقابل نبی اکرم ﷺ کی ساری سرگرمیاں بندگان خدا کو رشد و ہدایت کی شاہراہ دکھانے کی غرض و غایت کے محور پر گردش کرتی نظر آتی ہیں' آپ ﷺ تمام شعبہ ہائے زندگی میں خوشنودی رب کے نقیب و نمائندہ نظر آتے ہیں اور ہر سعی و عمل میں صبغۃ اللہ کا ایک ہی رنگ غالب ہوتا ہے۔

شعراء سے متعلق مذکورہ فرمودات الٰہی کے آخری ٹکڑے میں تیسری کسوٹی یہ دی گئی کہ شعراء گفتار کے غازی تو ہوتے ہیں لیکن کردار و عمل کی دنیا میں بالکل کھوکھلے نظر آتے ہیں۔ مختلف محفلوں کی زینت بنتے ہوئے اپنی طباعی اور زور بیانی کا لوہا تو منوا لیتے ہیں لیکن چونکہ وہ اخلاق و للہیت کے جذبے سے سرشار ہونے کی بجائے خود ثنائی اور داد و دہش کے طلب گار ہوتے ہیں اس لئے انہیں اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ سامعین یا مخاطبین کو نذر کئے جانے والے وعظ و نصیحت اور تلقین و ارشاد پر وہ خود عامل ہیں یا نہیں۔ اس کے برعکس نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم بنی نوع انسان کو وہی تعلیم دیتے ہیں جو ان کی عملی زندگی میں رچ بس گئی ہوتی ہے۔ اہل ایمان ساتھیوں کو خود نبی کریم ﷺ کی زبانی یہ تنذیر کرائی جاتی ہے :

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝ ﴾

(الصف : ۲۔۳)

''اے ایمان لانے والو! وہ باتیں کیوں کہتے ہو جنہیں کرتے نہیں ہو۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ انتہائی ناپسندیدہ ہے کہ تم وہ باتیں کہو جنہیں کرتے نہیں ہو۔''

قول و عمل میں تضاد دراصل منافقت کا کھلا ثبوت ہے جس کے نتیجے میں ایک انسان کو انتہائی پرلے درجے کے جہنم سے سابقہ پڑے گا' جیسا کہ اللہ ربّ العزت کی کتاب گویا ہے :

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ...﴾

(النساء : ۱۴۵)

''بلاشبہ منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے۔''

اور خود اللہ کے رسول ﷺ نے قول و عمل کے تضاد کی ہلاکت انگیزیوں سے بایں الفاظ متنبہ فرمایا :

((یجاءُ بالرّجلِ یومَ القیامۃِ فیلقٰی فِی النّار' فتندلق بہ اَقتابُہ فَیدور بھا فِی النار کمَا یدورُ الحمارُ بِرحاہ' فیطیف بہ اھل النار فیقولون : یا فلان مالَکَ ما اصابَکَ؟ اَلَم تکن تأمُرنا بالمعروف وَتنھانا عن المنکر؟ فقال : کنتُ آمرکُم بالمعروف ولا آتیہ وَاَنھاکم عن المنکر وآتیہ)) {۱۰}

''قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائے گا اور اس کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ پس اس کی آنتیں نکل پڑیں گی' پھر وہ ان آنتوں کو لے کر ایسا گھومے گا جیسا کہ گدھا چکی کو لے کر گھومتا ہے۔ پھر جہنم والے اس سے پوچھیں گے کہ اے فلاں اس سے تجھے کیوں سابقہ پڑا؟ کیا تم لوگوں کو معروف کا حکم نہیں دیتے تھے اور منکر سے نہیں روکتے تھے؟ پس وہ کہے گا کہ ہاں میں تم لوگوں کو کار خیر کا حکم دیتا تھا مگر خود عمل پیرا نہ ہوتا تھا اور تم لوگوں کو برائیوں سے روکتا تھا اور خود ان کا ارتکاب کرتا تھا۔''

شاعروں کے انعام و اکرام اور داد و دہش کی طمع کے برعکس ہادی اعظم ﷺ چونکہ اخلاص و للّٰہیت کے پیکر تھے یہی وجہ ہے کہ انسانیت کے ہدایت یاب ہونے کی فکر میں آپ اپنا چین و سکون کھو بیٹھے تھے۔ اس لئے دعوت و تبلیغ کی راہ میں خدا کے بندوں سے کسی

قسم کی اجرت طلبی کا خیال تک آپ کے دل میں نہ آتا تھا اور آپؐ برملا فرماتے تھے :

﴿ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ... ﴾ (سبا : ۴۷)

"کہہ دیجئے (اے نبیؐ) میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تم ہی کو مبارک رہے۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔"

قرآن حکیم کے ان تین معیارات کی روشنی میں یہ صداقت آشکار ہو جاتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف شاعری کا انتساب مشرکین مکہ کے دیانت دارانہ فیصلے کا غماز نہیں تھا' بلکہ وحی اور حامل وحی کو نیچا دکھانے کی اس سازش کا مظہر تھا جو انکار وحی اور رسالت پر منتج ہوتی تھی۔

شعر و شاعری سے بُعد و تنفّر کے باب میں احادیث نبوی بھی سند فراہم کرتی ہے۔ مسند احمد میں حضرت سعدؓ سے ایک روایت منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((لأن يمتلى جوف احدكم قيحًا يريه خيرٌ من أن يمتلى شعرًا)) {۱۱}

"اگر تم میں سے کسی کا پیٹ پیپ سے بھر جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ شعر سے بھرے۔"

ہجو یہ شاعر سے گریز کے باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بیان بھی ملاحظہ فرمائیں :

((مَن قال فى الاسلام هجاءً مقذعًا فلسانه هدر))

"جس کسی نے بھی اسلام میں فحش ہجو گوئی کی پس اس کی زبان ناکارہ اور رائیگاں جانے کے لائق ہے۔"

قرآن و حدیث کے مذکورہ بالا نصوص کے آئینے میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شعر گوئی ایک شنیع و دنی فعل ہے۔ لیکن شاعری کے قرآنی موقف کی بابت یہ تاثر یک طرفہ اور متعصبانہ ہو گا' کیونکہ شعر و شاعری کے باب میں کچھ دوسرے نصوص بھی ہیں جو مذکورہ بالا نصوص کے بالمقابل ہیں۔ بلاشبہ سورہ شعراء میں شعرائے کفار کی تذلیل و تحقیر

کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ وہ شعراء جو ایمان و یقین کی لذت و شیرینی سے کوسوں دور ہیں' جن کے قول و عمل میں تضاد ہے اور جو ظن و تخمین کی ہر ہر وادی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں وہ خدا کے نزدیک بڑے ذلیل لوگ ہیں۔ ان کا کلام انتہائی مذموم اور ان کا کردار انتہائی ملعون ہے۔ لیکن ان آیات کریمہ کے بعد ہی وہ ارشاد ربانی بھی قابل ملاحظہ ہے جو بلاشبہ شعرائے صالحین کو شعرائے کفار کے زمرے سے مستثنیٰ رکھنے کی سند فراہم کرتا ہے۔ سورۃ الشعراء کی آخری آیت کا ابتدائی حصہ ملاحظہ فرمائیں :

﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا﴾ (الشعراء : ۲۲۷)

"بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو (صرف) بدلہ لے لیا۔"

خدمتِ دین سے متعلق یہ قضیہ بالکل عیاں ہونا چاہئے کہ زبان و قلم دونوں ہی اس میں قابل ذکر طریقے سے رول ادا کرتے ہیں اور منثور و منظوم دونوں قسم کے سرمائے خدمتِ دین کے مبارک کام میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں جہاد فی سبیل اللہ کی جو تعلیم دی گئی ہے اس میں قول و عمل اور زبان و قلم سے تبلیغ کو ابتدائی مرحلے کی حیثیت حاصل ہے۔ سورۃ الشعراء کی مؤخر الذکر آیت اس ضمن میں بیّن ثبوت ہے کہ ایمان و ایقان کی نعمت سے بہرہ ور ہونے اور اعمالِ صالحہ سے اپنی زندگی کو آراستہ و پیراستہ کرنے والوں نیز ذکرِ الٰہی کو شیوۂ حیات بنانے والوں کے لئے شعر و شاعری کا شغل مذموم و معیوب نہیں ہے بلکہ وہ شاعری جس میں ایمان و یقین سے متضاد باتیں نہ ہوں' جس میں تعصّب و ہٹ دھرمی نہ ہو' جو کذب و بطلان سے پاک ہو اور جس میں کسی قسم کے شر و بغاوت کا شائبہ نہ ہو بڑی محبوب اور قابل تعریف ہے۔ شعر و شاعری سے متعلق قرآنی موقف کی وضاحت' احادیث نبویہ کے بغیر تشنۂ توضیح رہے گی۔ ذیل میں شاعری کی ترغیب و تشویق سے متعلق چند ارشاداتِ نبویؐ مرقوم کئے جاتے ہیں :

وہ حضرات جن کے دل شمع اسلام سے روشن ہو چکے تھے' جو نفرت و عداوت کے مسموم جذبات کو ختم کر کے دعوت اسلام کے شیدائی بن گئے تھے اور جن کی توجہات

پورے طور پر خدا اور اس کے رسول کی طرف مرکوز ہو گئی تھیں وہ اب یکسو ہو کر تحریکِ اسلامی کے شجرِ طیّب کو خون جگر سے سینچ رہے تھے اور جان و مال اور زبان و بیان کی قوت سے مقابلہ کرنے میں پیش پیش تھے۔ چنانچہ آنحضورؐ نے جب مشرکین کی دلدوز ہجو گوئیوں کو سنا تو آپؐ نے صحابہ کرام کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا :

((ما یمنع القوم الذین نصروا رسول اللّٰہ بسلاحھم ان ینصروہ بالسنتھم)) {۱۲}

"جن لوگوں نے اپنے رسولؐ کی مدد اسلحوں سے کی ہے ان کے لئے کون سی چیز حارج ہے کہ وہ اپنی زبانوں سے اس کی مدد کریں۔"

چنانچہ شعراء کفار کے ساتھ حضور اکرم ﷺ کی لسانی نبرد آزمائی کی تحریض و ترغیب پر شاعرِ رسولؐ حضرت حسانؓ کھڑے ہوئے۔ آپ نے سفیان بن الحرث کے بارے میں چند ایسے اشعار کہے کہ قریش کے لوگ چیخ پڑے کہ حسانؓ نے ایسے اشعار کہے ہیں جن کی وجہ سے ابن ابی قحافہ کا نام و نشان مٹ گیا۔ {۱۳}

شاعرِ اسلام حضرت حسانؓ سے متعلق ہی ایک روایت ہے جسے حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں :

((استأذن حسانُ بن ثابت رسولَ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم فی ھجاءِ المشرکین فقال رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم: فکیف بنسبی؟ فقال حسان: لأسلّنّک منھم کما تسلّ الشعرۃ من العجین))

"حضرت حسانؓ بن ثابت نے مشرکین کی ہجو گوئی کے سلسلے میں رسول خدا ﷺ سے اجازت چاہی پس رسول اللہ ﷺ نے پوچھا' میرے نسب کے سلسلے میں کیا ہو گا (یعنی میں بھی تو انہیں کے خاندان کا فرد ہوں تو پھر میں کیسے محفوظ رہ سکوں گا)؟ اس پر حضرت حسانؓ نے عرض کیا کہ میں ان کے درمیان سے آپؐ کو اس طرح نکال لوں گا جس طرح بال آٹے سے نکال لیا جاتا ہے"۔

جب حضور اکرم ﷺ ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تو چند نفوسِ قدسیہ کے

ساتھ حضرت حسان بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ آپؓ کا قبول اسلام جذباتی نہیں تھا اور نہ ہی وقتی تھی۔ چنانچہ آپ نے اخلاص وللّٰہیت اور شعورِ کامل کے ساتھ اس راہِ پُرخار میں قدم رکھا اور کفار قریش شعراء کے بالمقابل شاعری کی آماجگاہ میں ثابت قدم رہتے ہوئے نیز نبیؐ' اسلام اور دیگر مسلموں کی عزت و عصمت کو بچاتے ہوئے دندان شکن جواب دیتے رہے۔ جنگ احزاب کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کون ہے جو مسلمانوں کی عزت کی پاسداری کرے۔ حضرت کعب بن مالک نے عرض کیا کہ یہ خدمت میں انجام دوں گا اے رسول اللہ! عبداللہؓ بن رواحہ نے عرض کیا اے رسول اللہ! اس مہم کے لئے میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں اور حضرت حسانؓ بن ثابت نے عرض کیا کہ مسلمانوں کی عزت کے تحفظ و پاسداری کا یہ مقدس فریضہ میں انجام دوں گا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا' حسّان! تائیدِ الٰہی تمہارے شامل حال ہو گی تم ان کی ہجو گوئی میں سرگرم ہو جاؤ۔ اس سلسلے میں حضرت براءؓ سے منقول یہ روایت سنئے :

((ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لحسّان اھجھم او قال ھاجھم وجبرئیل معک)) {۱۵}

"(حضرت براءؓ سے مروی ہے کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان سے فرمایا کہ ان کی ہجو گوئی کرو یا فرمایا (راوی کو شبہ ہے) کہ ان کی ہجو کا جواب دو' یہاں حضرت جبرئیل کی معیت تمہیں نصیب ہے۔"

شاعری سے متعلق قرآن پاک کے موقف کی تعبیر و توضیح میں وہ ارشادات نبوی بھی ملحوظ رکھے جانے چاہئیں جو شعر کی عظمت و اہمیت پر شہادت بنتے ہوئے فکرِ مستقیم کے پیامی شعراء کرام کے لئے حوصلہ افزا پیغام اپنے جلو میں رکھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اشعار سے متعلق حکم فرمایا :

((انّ مِن الشّعرِ حِکمًا وَمِن البَیان سِحرًا)) {۱۶}

"یقیناً بعض اشعار میں حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں اور بعض بیانات میں سحر انگیزی۔"

شعر و شاعری سے متعلق قرآنی موقف کی تعبیر و وضاحت اور ایک متوازن رائے قائم کرنے کے باب میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی یہ حدیث بھی

معاون ثابت ہوتی ہے :

((الشِعرُ فیہِ کلامٌ حسنٌ و قبیحٌ فخُذِ الحسَن واترک القبیحَ)) {۱۷}

"شعر میں اچھے اور برے دونوں کلام ہوتے ہیں لہٰذا اچھے کو اختیار کرو اور برے کو چھوڑ دو۔"

شاعری کے جواز و عدم جواز اور استحسان و قباحت سے متعلق جو دلائل نقلیہ پیش کئے جاتے ہیں ان میں سے بیشتر سطور بالا میں مرقوم ہیں۔ دونوں قسم کے نصوص و شواہد کی روشنی میں شاعری سے متعلق اسلام یا قرآن کا جو موقف سامنے آتا ہے وہ یہ کہ اگر دین حنیف کا غلبہ و تفوق' اسلام اور مسلمانوں کی عزت و وقار' یوم الجزاء کی تذکیر و تلقین اور ذکر الٰہی کا استحضار اگر شاعری کے مقتضیات بن جاتے ہوں تو یہ بلاشبہ لائق تحسین اور قابل مبارکباد ہے۔ ایسی شاعری کو اللہ عزوجل کی کتاب اور رسول اکرم ﷺ کے فرمودات میں خدمت دین کے پہلو سے اعلیٰ درجے کا مقام حاصل ہے۔ اس کے برعکس اگر شاعری جاہلیت و عصبیت کے گھناؤنے جذبات کی حامل' ذکر الٰہی سے دور اور حیات بعد الممات کے فکر و احتساب سے عاری ہے تو یہ شاعری مذموم و معیوب ہے جو فلاح حقیقی کی منزل سے ہمکنار کرنے کی بجائے خسران و ناکامی کی نقیب بن کر ذلت و نکبت اور ہلاکت و بربادی کی عمیق کھائیوں میں گرا دیتی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے جب کعب بن مالک کا ایک شعر سنا جس میں جاہلیت کی بو آ رہی تھی تو آپؐ نے جاہلیت کے غماز کلمہ کو بدل دینے کا حکم صادر فرمایا' نابغہؓ جعدی کا ایک شعر سماعت فرمایا اور آپؐ کو احساس ہوا کہ اس کے اندر جاہلی فخر و حماسہ کے جذبات کار فرما ہیں تو آپؐ نے شاعر سے مشتبہ الفاظ کا مفہوم دریافت کیا اور پھر اطمینان ظاہر فرمایا۔ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے ایک شعر پڑھا اور پھر بیان کیا کہ جب یہ شعر نبی کریم ﷺ کے پردۂ سماعت سے ٹکرایا تو آپؐ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اس منظر کو دیکھ کر میں کبیدہ خاطر ہوا اور آپؐ کی ناپسندیدگی دور کرنے کی کوشش کی اور ایک دوسرا شعر پڑھا تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے تاباں پر بشاشت رقصاں ہو گئی {۱۸}۔

شاعری بلاشبہ اہل عرب کی گھٹیوں میں رچی بسی تھی۔ اسے تمام شعبہ ہائے زندگی کے دیوان کی حیثیت حاصل تھی اس لئے وہ کسی قیمت پر بھی اپنے اس سرمایہ افتخار سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ نزول قرآن سے قبل کی شاعری میں عصبیت و ہٹ دھرمی' منافرت و چپقلش' کبر و ریا' کذب و بطلان اور دوسرے جاہلی عادات و خصائل کی بھرپور نمائندگی ہوتی تھی۔ زعمائے قریش اور دیگر مشرکین مکہ قرآن اور صاحب قرآن کی طرف شاعری کا انتساب کر کے نبوت کے مقدس منصب کو مجروح کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں شعر و شاعری سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو منزہ رکھنا اور خلاف شان نبوت قرار دینا نیز شاعری کی غرض و غایت اور اس کے موقف کو طشت از بام کر دینا ایک امر ناگزیر تھا جس سے قرآن اور صاحب قرآن کا گریز ہمہ گیر دعوت اور حکمت عملی کے خلاف تھا۔ قرآن نے تعلیم دی کہ شاعری کا وسیلہ اظہار جذبات ہونا مذموم و معیوب نہیں ہے۔ ہاں اگر اس میں جاہلیت کی بو آتی ہو اور رشد و ہدایت کی بجائے ضلالت و گمراہی کی ترجمانی و تلقین ہوتی ہو تو یہ شاعری بہرحال اللہ اور اس کے رسول کی نگاہ میں عزت و احترام کے لائق نہیں ہے۔ اس کے برعکس اللہ عزوجل کی حمد و ستائش رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف' اسلام اور اہل اسلام کی عزت و ناموس کی پاسداری اور دین حنیف کی سرخروئی و سربلندی کے دیگر مظاہر میں اگر شعر کی زبان کو اظہار و بیان کا ذریعہ بنایا جا رہا ہو تو یہ بلاشبہ مبروک اور تحسین آفرین ہے۔

محفلوں اور مجلسوں کی زینت بننا' سامعین کی داد و دہش کا طلبگار ہونا' اپنے کلام کے جوہر بکھیر کر حاضرین پر رعب و جلال طاری کر دینے کی خواہش کرنا یہ تمام ایسے اسباب و محرکات ہیں جو جاہلی حمیت و جذبات کے حصار میں رہتے ہوئے تکلف' تصنع' کذب اور مبالغہ آرائی جیسی فکری اور فنی خامیوں کو جلا دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بسا اوقات یہ احساسات و خیالات اور اوہام و خرافات کی ایسی وادیوں میں لا کھڑا کرتے ہیں جہاں فکر سلیم اور صراط مستقیم کا کوئی گزر نہیں ہوتا۔ آج بھی شعراء حضرات اپنی تصویر قرآن و سنت کے صاف و شفاف آئینے میں دیکھ سکتے ہیں اور اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا احتساب کرتے ہوئے حضرت حسانؓ' کعبؓ بن مالک اور عبداللہؓ بن رواحہ کی معزز صف میں

شامل ہو سکتے ہیں جبھی فکری و فنی حیثیت سے آسمان ادب پر چمکتے ہوئے وہ اپنے آپ کو آخرت کی لازوال مسرتوں کا مستحق بنا سکیں گے۔

حواشی

{۱} آل عمران : ۱۹
{۲} آل عمران : ۸۵
{۳} الحجرات : ۱۳
{۴} ابن سلام' طبقات الشعراء ج۱' صفحہ ۱۰' طبع اول ۱۴۰۲ھ' بیروت
{۵} ابن قتیبہ' تاویل مشکل القرآن' ص ۱۴
{۶} ابن خلدون' مقدمہ ابن خلدون' ج۱' صفحہ ۵۵۳' قاہرہ
{۷} عبدالحلیم ندوی' تاریخ ادب عربی ج۱' صفحہ ۲۳۰' طبع سوم ۱۹۸۹ء' نئی دہلی
{۸} ابن کثیر' تفسیر ابن کثیر ج ۳' صفحہ ۵۷۹' طبع اول' ۱۴۰۰ھ
{۹} ثناء اللہ الامرتسری' تفسیر القرآن بکلام الرحمن' صفحہ ۲۵۹' ۱۳۴۷ھ' مطبع برقی' امرتسر
{۱۰} احمد بن محمد حنبل' مسند احمد' ج ۵' صفحہ ۲۰۵
{۱۱} مسلم بن حجاج القشیری' الصحیح لمسلم' ج ۲' کتاب الشعر' صفحہ ۲۴۰
{۱۲} سامی مکی العانی' الاسلام والشعر ص ۶۸' کویت
{۱۳} ابن عبدالبر' الاستیعاب فی اسماء الاصحاب' ج۱' صفحہ ۳۳۵' مصر
{۱۴} ابو محمد بن اسماعیل البخاری' الصحیح للبخاری' کتاب الادب ج ۲' صفحہ ۹۰۹۔۹۰۸
{۱۵} ابو محمد بن اسماعیل البخاری' الصحیح للبخاری' کتاب الادب ج ۲' صفحہ ۹۰۹
{۱۶} احمد بن محمد بن حنبل' مسند احمد' ج۱' صفحہ ۲۶۹
{۱۷} ابن رشیق القیروانی' العمدہ فی صناعہ الشعر و نقدہ' صفحہ ۹' طبع اول ۱۳۲۵ھ' مصر
{۱۸} سامی مکی العانی' الاسلام والشعر' صفحہ ۴۹۔۵۰' کویت

اطلاع برائے قارئین

رمضان المبارک کے دوران دفتری اوقات میں کمی اور عید الفطر کی تعطیلات کے باعث آئندہ حکمت قرآن کا فروری مارچ ۱۹۹۸ء کا مشترکہ شمارہ شائع ہو گا۔ قارئین کرام نوٹ فرمالیں۔

عصری مسائل کا حل
سیرتِ طیّبہ کی روشنی میں (۳)

ممتاز احمد اعوان ☆

۷) معاشی مسائل اور سیرتِ طیّبہ

عالم اسلام معاشی عدم تعاون اور عدم منصوبہ بندی کی وجہ سے گوناں گوں مسائل سے دوچار ہے۔ دنیا کے امیر ترین ممالک کا تعلق اسلامی دنیا سے ہی ہے' لیکن ان کے باہمی عدم اشتراک عمل کی وجہ سے دنیا کے غریب ترین ممالک بھی عالم اسلامی ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ پوری اسلامی دنیا' اہل مغرب کے اس اقتصادی جال میں پھنسی ہوئی ہے جس سے نکلنے کی جس قدر کوشش کی جاتی ہے وہ اسی قدر اس میں پھنستے چلے جارہے ہیں۔ اس صورت حال میں معاشی تعاون' اپنے معاشی وسائل کو فروغ دینا' خود کفالت' قناعت (اپنے وسائل کے مطابق اخراجات بڑھانا) اور خود اعتمادی ہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر مسلمان اپنا تشخص اور خودداری برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں سیرت طیبہ ہمارے لئے مینارۂ نور کا کام دے سکتی ہے۔ سیرت طیبہ کی روشنی میں اقتصادی تعاون کا قیام عمل میں لایا جاسکتا ہے۔

زندگی کے ہر شعبے میں تعاون کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا' لیکن معاشی شعبے میں تعاون مزید اہمیت کا حامل ہے۔ اسی مقصد کے لئے کوآپریٹو سوسائٹیاں بنتی ہیں جو مختلف لوگوں کو قرضے اور امداد (مالی اور فنی) مہیا کرتی ہیں۔ اس تعاون کی ایک شکل زکوٰۃ بھی ہے۔ زکوٰۃ کا حقیقی فلسفہ تو یہی ہے کہ معاشی جدوجہد میں معاشی یا جسمانی طور پر اگر کوئی حادثے کا شکار ہو جائے تو اسے گرا ہی نہ رہنے دیا جائے بلکہ اس کی دستگیری کرتے ہوئے

☆ اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج پیپلز کالونی گوجرانوالہ

اسے اٹھا کر اس کی کچھ مدد کر کے اسے دوبارہ معاشی جدوجہد کے قابل بنا دیا جائے تاکہ وہ معاشی طور پر معاشرے کا بیکار فرد نہ بن جائے بلکہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔

نبی کریم ﷺ نے مکی اور مدنی دور میں اقتصادی تعاون کا ایسا نقشہ پیش فرمایا کہ جس کے کامیاب مثبت اثرات کو آج بھی آپؐ کے معجزنما کارناموں اور آپ کے پیدا کردہ انقلاب کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مکی زندگی میں صحابہ کرامؓ زیردست تھے' انہیں کفار کے ظلم و تشدد کا سامنا تھا۔ اس دور میں آپؐ نے انہیں یہ طریق کار بتایا کہ ہر شخص اپنے ہمسایہ کا خیال رکھے۔ جب ہر شخص اپنے ساتھ والے کا خیال رکھے گا تو معاشرے کے تمام افراد میں ایک ایسا رابطہ قائم ہو جائے گا جس میں کوئی رخنہ موجود نہ ہو گا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ :

((مَن کان یؤمنُ باللّٰہ وَالیومِ الآخر فلیُحْسِن الٰی جارِہ))
"جو کوئی اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ اپنے ہمسائے سے اچھا سلوک کرے"۔ (۵۷)

نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم نے مسلمانوں کی مکہ مکرمہ میں اس انداز سے تربیت فرمائی کہ روزانہ ایک دوسرے کے گھر اپنے ہاں پکنے والی چیز بھیجا کرو۔ اس سے باہمی محبت بھی بڑھے گی اور دوسرے کی مدد بھی ہو جائے گی۔ ایسا بھی ہوتا کہ ایک کا مہمان دوسرا شخص اپنے گھر لے جاتا۔

مدینہ طیبہ میں مواخات کا معاہدہ عمل میں آیا۔ انصار نے مہاجرین کو مہمان کی حیثیت دینے کی بجائے انہیں اپنے کاروبار اور زراعت میں شریک کر لیا اور انہیں کھیتی باڑی سکھلائی۔ انصار نے پیشکش کی کہ کھیتی پر محنت انصار ہی کریں گے اور آمدنی میں ہر دو شریک ہوں گے' لیکن مہاجرین کی خودداری تھی کہ انہوں نے اپنے انصاری بھائیوں پر بوجھ بننا گوارا نہ کیا اور ان سے اسی قدر مدد قبول کی جو ناگزیر تھی اور جلد ہی مہاجرین اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ {۵۸}

نبی کریم ﷺ کی معاشی زندگی میں ہمیں نظر آتا ہے کہ آپؐ نے ابتدائی زندگی میں خود معاشی جدوجہد میں حصہ لیا۔ بطور نبی اپنے فرائض میں ہمہ وقت مصروف ہونے کے

باوجود آپ کبھی کسی کے دستِ نگر نہیں ہوئے۔ آپؐ نے معاشی شعبے میں بھی اپنی خودداری اور بے نیازی کو برقرار رکھا۔{۵۹} آپؐ کی معاشی زندگی کے مطالعہ سے جو اہم اصول واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں وہ یہ ہیں :

(i) مومن کو پوری جدوجہد کرنی چاہئے اور اسے کسی کے سامنے محتاج نہیں ہونا چاہئے۔

(ii) فرد کی معاشی احتیاجات کی تکمیل کیلئے ریاست بھی ذمہ دار ہے۔ اس سلسلے میں اسے بھی اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ لیکن فرد بھی اس بات کا خیال رکھے کہ خواہ مخواہ توکّل' عزم وہمت' عزت نفس اور خودداری اور قناعت کو ہاتھ سے جانے نہ دے اور حتی المقدور اپنے معاشی مسائل خود حل کرنے کیلئے جدوجہد بھی کرے اور وسائل بھی تلاش کرے۔ سرمایہ چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے سے بچانے کیلئے اور سرمایہ دارانہ نظام کے استیصال کیلئے نبی کریم ﷺ نے دو موثر طریقے اختیار فرمائے' یعنی قانون اور اخلاق دونوں ذرائع سے سرمایہ دارانہ نظام کی بیخ کنی کی۔

جاہلیت کی معاشرتی زندگی کی طبقاتی تقسیم نے معاشی جدوجہد کو بھی متاثر کیا تھا۔ لوٹ کھسوٹ اور بدنظمی معاشی زندگی کا حصہ بن گئی تھی۔ سود کی لعنت سے سرمایہ دار طبقہ پل رہا تھا اور غریب کا خون نچڑ رہا تھا۔ شراب نے جوئے کے ساتھ مل کر معاشی جدوجہد کو مفلوج کر دیا تھا۔ ذرائع آمدنی پر سرمایہ داروں کا قبضہ تھا۔ صرف دولت پر بھی کسی طرح کا کوئی اخلاقی اصول کارفرما نہ تھا اور ہر معاشی جدوجہد خود غرضی اور سنگدلی پر مبنی تھی۔

اس تمام صورت حال کا خاتمہ نبی کریم ﷺ نے مستقل بنیادوں پر فرمایا۔ چنانچہ سود ختم کیا اور سب سے پہلے اپنے خاندان کا سود ختم کیا۔ آئندہ کے لئے ایسا کرنے والے کو خدا اور رسولؐ کا باغی قرار دیا۔ تجارت کے تمام باطل طریقے ختم کئے۔ رزق حلال کی دعوت دی۔ شراب اور جوئے کو حرام کیا۔ فضول خرچی کو شیطانی فعل قرار دیا۔ اعتدال کو اقتصادیات کی روح قرار دیا۔ نبی کریم ﷺ نے وسائل معیشت کی ترقی پر بہت زور دیا۔ اس سلسلے میں چند فرموداتِ نبوی ملاحظہ ہوں :

(i) قال رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم : ((اطلبوا الرزقَ فی خبایا الارضِ)){۶۰}

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "رزق کو زمین کی پہنائیوں میں تلاش کرو"۔
علامہ سرخسی فرماتے ہیں کہ اس فرمان نبویؐ میں زراعت و کاشتکاری مراد ہے۔

(۲) نبی کریم ﷺ نے فرمایا : ((عَمِّرُوا بلادی فعاش فیھا عبادی))[۶۱] یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میری بستیوں کو آباد کرو تاکہ اس میں میرے بندے زندگی بسر کر سکیں۔

علامہ سرخسی بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جرف کے مقام پر خود بھی کاشت فرمائی تھی۔[۶۲] شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے نبی کریم ﷺ کے اس سلسلے میں فرامین کے مقاصد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تجارت' زراعت اور صنعت انسانی تمدن کے لئے ناگزیر ہے۔ جب قومیں معاشی وسائل کے فروغ و ترقی سے توجہ ہٹا کر عیش و عشرت کی زندگی میں منہمک ہو جاتی ہیں اور سرمایہ دارانہ سربلندیوں اور مسرفانہ رفاہیت میں باہمی مقابلہ کو معیار حیات بنالیتی ہیں تو ان کا تمدن کبھی پھل پھول نہیں سکتا اور ان کی غیر طبعی عیش کوشی جلد ہی انہیں لے ڈوبتی ہے۔[۶۳] شاہ صاحبؒ کی یہ تشریح درحقیقت احادیث نبویہ کی روشنی میں ہی ہے۔

(۳) قال رسولُ اللہ ﷺ ((طلبُ کسبِ الحلالِ فریضۃٌ بعدَ الفریضۃِ))[۶۴]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "حلال رزق کے لئے کوشش فرض نمازوں کے بعد سب سے بڑا فرض ہے۔"

(۴) قال رسول اللہ ﷺ : ((اذا صلّیتمُ الفجرَ فلا تنوموا عن طلبِ ارزاقِکم))[۶۵]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "جب تم فجر کی نماز پڑھ کر فارغ ہو جاؤ تو اپنے رزق کی جدوجہد کے بجائے سو مت جایا کرو۔"

(۵) قال رسول اللہ ﷺ : ((الذنوب ذنوبٌ لا یکفّرھا الا الھمّ فی طلبِ المعیشۃ))[۶۶]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "گناہوں میں سے بعض گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ

صرف طلبِ معیشت کی فکر اور جد و جہد میں کاوش ہی سے ہو سکتا ہے۔"

(٦) قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ : ((مَا اَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ اَنْ يَاكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ)) {٦٧}

نبی کریم ﷺ نے فرمایا : "کوئی کھانا اس سے زیادہ بہتر نہیں جو اپنے ہاتھ سے کما کر کھایا جائے۔"

اسی طرح تجارت 'صنعت اور دیگر پیشوں کے بارے میں احادیثِ نبویہ موجود ہیں۔ {٦٨}

آج ہم اپنے معاشی مسائل کا حل تلاش کرتے ہوئے بھی مغرب کے دیئے ہوئے سبق ہی کو دہراتے ہیں اور اس اہم پہلو کو بھول جاتے ہیں کہ جب ہم وسائلِ معیشت کو فروغ دیں گے تو معیشت کو بھی ترقی حاصل ہوگی اور بے روزگاری کا بھی خاتمہ ہوگا۔ اسی طرح مالی شاہ خرچیوں' سرکاری کارندوں کے ناز نخروں پر اٹھنے والے کروڑوں روپے کے اخراجات اور عیاشانہ طرز زندگی کی طرف کبھی توجہ نہیں کی اور مسلمان ملکوں کی افرادی قوت اور دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کے بڑھنے سے خائف ہوتے ہوئے مغرب کے اسی ایک سبق اور راگ کو الاپتے چلے جاتے ہیں کہ "آبادی" ہمارے معاشی مسائل کا سبب ہے۔ حالانکہ اس کے اصل اسباب عیش پرستی اور وسائل معیشت کو فروغ نہ دینا ہیں۔

ہمارے معاشی مسائل کا ایک حل تعلیماتِ نبویؐ کی روشنی میں یہ ہے کہ ہم اخراجات میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کریں۔ اس سلسلے میں ارشاداتِ نبویؐ ملاحظہ ہوں :

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((الْاِقْتِصَادُ فِي النَّفَقَةِ نِصْفُ الْمَعِيْشَةِ)) {٦٩}

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "اخراجات میں میانہ روی معاشی زندگی (کی خوشگواری) کا نصف حصہ ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اخراجات اپنے وسائل آمدنی سے بڑھنے نہیں چاہئیں۔ حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ نے انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں بھی یہی اصول دیا ہے

کہ اعتدال کو پیش نظر رکھا جائے۔ حضرت کعبؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ((اَمسِکْ علیکَ بعضَ مالکَ فھو خیرٌ لکَ)) قلتُ : امسکُ سھمی الذی بخیبر {۷۰} "اپنے مال میں سے کچھ بچالو یہ تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔" تب میں نے کہا کہ "خیبر کی زمین میں جو میرا حصہ ہے وہ میں نے بچالیا ہے۔"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا : اپنے ورثاء کو صاحب مال چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ وہ محتاج رہ جائیں اور وہ دوسروں سے مانگتے پھریں۔ {۷۱} مسند احمد اور طبرانی میں حضرت ابوالدرداءؓ سے نبی کرم ﷺ کا یہ فرمان منقول ہے : ((مِن فقہِ الرجل رفقہٗ فی معیشتہ)) {۷۲}

"کسی شخص کی عقل مندی میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ اپنی معیشت میں نرمی اعتدال اختیار کرے"۔

عیش و عشرت کے رجحانات

عصر حاضر میں اخلاقیات کو غیر ضروری قرار دے کر اسے فراموش کر دیا گیا۔ صرف تن اور حواس کی زندگی کو حقیقی زندگی قرار دینے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ زندگی محض ہوس پرستی اور عیش و عشرت کا نام بن کر رہ گئی ہے۔ نفسانی خواہشات بے قابو ہو گئی ہیں۔ معاشرتی اور اخلاقی انارکی پیدا ہو گئی ہے اور انسانیت' حیوانیت کی راہ پر چل پڑی ہے اور اشرف المخلوقات وہ گل کھلا رہا ہے کہ اپنے کردار سے اسے خود گھن آنی چاہئے۔

نبی اکرم ﷺ نے معاشرتی سکون کے لئے تن پرستی اور ہوس مال و زر سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے : ((من لبس ثوب شھرۃٍ فی الدنیا البسہ اللہ ثوب مذلۃٍ یومَ القیامۃِ)) {۷۳} "جس شخص نے دنیا میں شہرت اور فخر و غرور کے لئے لباس پہنا' اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنائیں گے"۔

تن پرستی اور اظہار زیب و زینت ایک ایسا نفسیاتی اور معاشرتی مسئلہ ہے کہ اس

سے ایک طرف اسراف و تبذیر کی خرابی پیدا ہوتی ہے تو دوسری جانب دوسرے لوگوں میں احساس محرومی پیدا ہوتا ہے جو بالآخر امیر اور غریب کے درمیان نفرت اور حسد کے جذبات کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے ان بنیادوں ہی کو ختم فرمادیا جن سے یہ خرابی پیدا ہوتی ہے۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ : نَهَانَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَشْرَبَ فِي آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَاَنْ نَاْكُلَ فِيهَا وَعَنْ لُبْسِ الْحَرِيرِ وَالدِّيبَاجِ وَاَنْ يَجْلِسَ عَلَيْهِ {۷۴} "ہمیں نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا کہ ہم سونے اور چاندی کے برتن میں کھائیں پئیں اور ریشم اور دیباج کے کپڑے پہننے اور ان کے بچھونوں پر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا"۔ نبی اکرم ﷺ کا مقصد یہی تھا کہ مال و دولت کی نمائش اور اس نمائش میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی حوصلہ شکنی ہو تاکہ دوسرے طبقہ میں احساس محرومی پیدا نہ ہو۔

ہمارے دور کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جو ہمارے معاشرے کو گھن کی طرح کھائے جارہے ہیں۔ ان مسائل کے نتیجے میں معاشرے میں اخلاقی' معاشرتی' سیاسی اور معاشی خرابیاں جنم لے رہی ہیں۔ ہم ان خرابیوں اور مسائل کا رونا ہر وقت روتے رہتے ہیں لیکن ہمیں اس کا شعور نہیں ہوتا کہ مسائل کیسے پیدا ہوئے اور ان کا حل کیا ہے۔ عصر حاضر کے مسائل کے حوالے سے یہ بات واضح ہے کہ ان مسائل کی جڑ اور بنیاد (بقول ڈاکٹر خالد علوی) دو چیزیں ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ سے انسان کا رشتہ کمزور پڑ گیا ہے۔ گویا نہ اس کی رضا کی خاطر نیکی کی طرف رغبت عام رہی ہے اور نہ ہی اس کے خوف سے برائی سے بچنے کا جذبہ باقی رہا ہے۔

(۲) دنیا سے محبت اور اس میں استغراق۔ {۷۶}

اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان بڑا جامع ہے کہ ثوبان کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "قریب ہے کہ دنیا کی قومیں ایک دوسرے کو تم پر جھپٹ پڑنے کی دعوت دیں جس طرح میزبان خاتون (کھانا چننے کے بعد) کھانے والوں کو دسترخوان کی طرف بلاتی ہے"۔ یہ سن کر صحابہؓ میں سے کسی نے پوچھا : (کیا وہ لوگ اس لئے ہم پر غلبہ حاصل کرلیں گے کہ) ہم اس وقت تعداد میں کم ہوں گے۔ آپؐ نے فرمایا : **تم اس**

وقت بہت زیادہ تعداد میں ہو گے' لیکن تمہاری حالت ایسی ہو گی جیسے سیلاب کا جھاگ ہوتا ہے (یعنی تم بالکل بے وقعت اور کمزور ہو چکے ہو گے) تمہاری ہیبت دشمنوں کے دل سے نکل جائے گی اور تمہارے دلوں میں وہن (ضعف) پیدا ہو جائے گا۔ کسی نے پوچھا: یا رسول اللہؐ یہ "وہن" کیا ہے؟ فرمایا: "دنیا کی محبت اور موت سے نفرت"۔ {۷۶}

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جس قوم میں مال غنیمت میں خیانت (سرکاری خزانہ) کرنے کا عیب پیدا ہو جائے اس کے دلوں میں دشمنوں کا رعب پیدا کر دیا جاتا ہے۔ جس قوم میں زناکاری پھیلتی ہے اس میں اموات کی زیادتی ہو جاتی ہے۔ جو قوم ناپ تول میں کمی بیشی کرتی ہے اس کا رزق کم کر دیا جاتا ہے۔ جو قوم احکام نافذ کرنے میں عدل و انصاف کو ملحوظ نہیں رکھتی اس میں خونریزی پھیل جاتی ہے اور جو قوم عہد توڑتی ہے اس پر دشمن کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔ {۷۷}

حواشی

{۵۷} ابن ماجہ' کتاب الاداب باب حق الجوار' جلد دوم' ص ۱۲۱۱
{۵۸} بخاری' صحیح بخاری باب اخاء النبی' جلد پنجم' ص ۸۸
{۵۹} مسلم' الجامع الصحیح' کتاب الجہاد' جلد پنجم' ص ۱۶۲
{۶۰} علی المتقی' کنز العمال' جلد دوم
{۶۱} الرخسی' المبسوط' جلد ۲۳' کتاب المزارعہ
{۶۲} الرخسی' المبسوط' جلد ۲۳' ص ۲
{۶۳} شاہ ولی اللہ' حجۃ اللہ البالغہ' جلد دوم' ص ۱۰۶
{۶۴} مشکوۃ المصابیح' باب الکسب وطلب الحلال' بحوالہ شعب الایمان للبیہقی
{۶۵} کنز العمال' جلد دوم
{۶۶} حفظ الرحمٰن سیوہاروی' مولانا' اسلام کا اقتصادی نظام' ص ۶۳
{۶۷} ابن ماجہ جلد دوم' ص ۷۲۴' کتاب التجارہ باب الحث علی المکاسب
{۶۸} اس سلسلے میں کتب حدیث کی کتاب البیوع' کتاب التجارہ' کتاب المزارعہ وغیرہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔
{۶۹} علی المتقی' کنز العمال' جلد دوم' ص ۱۲
{۷۰} بخاری' الجامع الصحیح' باب الصدقات
{۷۱} بخاری الجامع الصحیح' کتاب الوصایا
{۷۲} بحوالہ رازی فخر الدین' تفسیر کبیر' جلد ۱۹' ص ۴۲

(باقی حواشی صفحہ ۵۶ پر)

سُوْرَةُ الْبَقَرَة

آیات ۱۰۶ -- ۱۰۷

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ' الاعراب' الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغۃ کیلئے ۱' الاعراب کیلئے ۲' الرسم کیلئے ۳' اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۶۴

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

۲ : ۶۴ : ۱ اللغة

لغوی اعتبار سے تو اِس پورے قطعہ میں صرف ایک ہی لفظ "نَنْسَخْ" نیا ہے' باقی تمام کلمات براہ راست یا بالواسطہ پہلے گزر چکے ہیں۔ لہٰذا عبارت کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں

تقسیم کر کے ہر ایک کلمہ کا ترجمہ مع گزشتہ حوالہ لکھ دینا کافی ہوگا۔

۲ : ۶۴ : ۱(۱) [مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا.....]

❶ "مَا" (جو بھی۔ جس کو بھی) یہاں "مَا" موصولہ بطور شرطیہ ہے، دیکھئے [۲:۲:۱(۵)]

❷ "[نَنۡسَخۡ]" کا مادہ "ن س خ" اور وزن "نَفۡعَلۡ" ہے۔ یعنی یہ فعل مجرد سے صیغہ مضارع مجزوم جمع متکلم ہے (جزم کی وجہ "الاعراب" میں آئے گی)۔

● اِس مادہ سے فعل مجرد "نسَخ...... ینسَخُ نَسۡخاً" (فتح سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں "...... کو (اس کی جگہ سے) ہٹا دینا۔ مٹا دینا" (اس کی جگہ کوئی دوسری چیز لائی جائے یا نہ لائی جائے)۔ اس فعل کا مفعول بنفسہ (منصوب) آتا ہے، مثلاً کہتے ہیں "نسخَتِ الریحُ الأثرَ" (ہوا نے نشان کو مٹا دیا)۔ پھر اس فعل میں بلحاظ استعمال کئی مفہوم پیدا ہوتے ہیں۔

❶ بعض دفعہ اس میں کسی چیز کو ہٹا کر خود (فاعل کا) اس کی جگہ لے لینے کا مفہوم ہوتا ہے، مثلاً کہتے ہیں "نسخَ الشیبُ الشبابَ" (بڑھاپے نے جوانی کو ہٹا دیا، یعنی خود اس کی جگہ لے لی) ❷ اور بعض دفعہ ان ہی معنوں کے لئے ہٹائی جانے والی چیز تو عبارت میں مفعول بنفسہ (منصوب) ہو کر آتی ہے مگر اس کی جگہ لائی جانے والی چیز کا ذکر "بِ" (کے ذریعے) کا صلہ لگ کر ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں "نسَخ شیئاً بشیءٍ" (اس نے ایک چیز کو کسی دوسری چیز سے ہٹا دیا یعنی پہلی کو ہٹا کر دوسری اس کی جگہ لایا) تاہم یہ "بِ" کے صلہ والا) استعمال قرآنِ کریم میں نہیں آیا۔ ❸ پھر اسی سے اس فعل میں "ہٹا کر دوسری جگہ لے جانا" کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں "نسخَتِ الشمسُ الظلَّ" (سورج نے سائے کو ہٹا دیا، یعنی اسے دوسری جگہ لے گیا) اور ❹ پھر اسی "منتقل کرنا" سے اس میں اصل کے مطابق "نقل کرنا" کے معنی آتے ہیں یعنی اصل کو ہٹائے یا مٹائے بغیر بلکہ اسے ثابت اور برقرار رکھتے ہوئے اس جیسی دوسری چیز تیار کر لینا۔ مثلاً کہتے ہیں "نسخَ الکتابَ" (اس نے کتاب (سے دوسری کتاب یا عبارت) حرف بحرف نقل کر لی، لکھ لی۔)

● قرآنِ کریم کی کتابت میں (عموماً) استعمال ہونے والے خط کو "خطِ نسخ" (جو عربی خطوطِ جمیلہ کی ایک قسم ہے) اسی لئے کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کا ہر نسخہ ہمیشہ کسی دوسرے نسخہ سے (بلحاظ طریق املاء و ہجاء) ہو بہو نقل کیا جاتا ہے۔ [خود "نسخۃ" کا لفظ، جو فعل نسَخ ینسَخ سے ہی ماخوذ ایک اسم ہے، قرآنِ کریم میں آیا ہے (الاعراف: ۱۵۴) جس کے اصل معنی تو ہیں "جس سے نقل کیا گیا" (منقول عنہ) تاہم جو "نقل کیا گیا" (منقول) اسے بھی "نُسخۃ" ہی کہتے ہیں

کیونکہ وہ اصل کا قائم مقام ہے۔ یہ لفظ (نسخہ) اُردو میں (بعض دوسرے معانی کے لئے بھی) مستعمل ہے۔

● اور اِس فعل "نَسَخَ" کے ان ہی (مندرجہ بالا) معانی میں استعمال کی بناء پر راغب رحمہ اللہ نے (مفردات میں) لکھا ہے کہ "نَسْخ" میں "ازالۃ" (یعنی اصل کو ہی ہٹا یا مٹا دینا) کا مفہوم بھی ہوتا ہے اور کبھی (اصل کے) "اثبات" (برقرار رکھنا) کا مفہوم بھی ہوتا ہے اور کبھی بیک وقت دونوں مفہوم موجود ہوتے ہیں۔

● اور اِس "ہٹا دینا' مٹانا" سے ہی اس فعل "نسَخ ینسَخ" کا ایک ترجمہ "منسوخ کر دینا" بھی کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا ہے۔ ("منسوخ" خود اس فعل سے اسم المفعول ہے بمعنی "ہٹا دیا ہوا") اور چونکہ اُردو--- خصوصاً پُرانی اُردو---- میں "موقوف کرنا" بمعنی "ہٹا دینا' برطرف کرنا" (مثلاً نوکری سے) بھی استعمال ہوتا ہے اِس لئے بعض مترجمین قرآن نے اس کا ترجمہ "موقوف کرنا" بھی کیا ہے۔

● اس فعل مجرد سے قرآنِ کریم میں صرف فعل مضارع کے دو ہی صیغے دو جگہ آئے ہیں (دوسرا صیغہ الحج :۵۲ میں ہے)۔ اس کے علاوہ مزید فیہ کے باب استفعال سے ایک صیغہ فعل اور ثلاثی مجرد سے ماخوذ ایک اسم "نُسْخَة" بھی ایک جگہ آیا ہے (جس کا ابھی اُوپر ذکر ہوا ہے)

● قرآنِ کریم میں یہ فعل مجرد (دونوں جگہ) اپنے اصل بنیادی ("ہٹا دینا" والے) معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔ اس طرح یہاں "مَانَنْسَخْ" کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "جو بھی/ جس کو بھی ہم ہٹا دیتے ہیں/ موقوف کر دیتے ہیں/ منسوخ کر دیتے ہیں"۔ بعض مترجمین نے "کر دیتے" کی بجائے (جس میں "تکمیل" یعنی "پوری طرح کرنا" کا مفہوم ہے) صرف "کرتے" سے ترجمہ کیا ہے جو لفظ سے زیادہ قریب ہے۔ بعض نے زمانہ حال کی بجائے صرف مضارع یعنی "کر دیں" سے ہی ترجمہ کیا ہے۔ (عربی میں مضارع زمانہ حال اور مستقبل دونوں کا مفہوم رکھتا ہے) جب کہ بعض حضرات نے ضمیر تعظیم کا لحاظ کرتے ہوئے "ہم منسوخ فرما دیں" سے ترجمہ کیا ہے۔ البتہ جن حضرات نے "مَا" کا ترجمہ ("جو بھی/ جس کو بھی" کی بجائے) "جب" سے کیا ہے یہ محلِ نظر ہے' کیونکہ یہ تو "اِذَا" یا "اِذْ" کا ترجمہ لگتا ہے۔ اور "مَا" اگر ظرفیہ بھی ہو تو اس کا اُردو ترجمہ "جب تک یا جتنی دیر تک" ہوتا ہے۔

(۳) "مِنْ آیةٍ" (کسی آیت میں سے/ کوئی بھی آیت) "مِن" جو مشہور حرف الجر ہے یہاں تبعیض کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور تنصیص نکرہ (نکرہ کی قطعیت اور تاکید) کے لئے

بھی۔ دیکھئے البقرہ :۳ [۲: ۲: ۱(۵)] ۔ پہلی (تبعیض کی) صورت میں اس مرکب کا ترجمہ "کسی آیت/ میں سے/ کا کچھ حصّہ" ہو سکتا ہے۔ مترجمین میں سے بعض نے اس کا ترجمہ "آیتوں میں سے" کی صورت میں کیا ہے جس میں واحد کا بصورتِ جمع ترجمہ تفسیری ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح بعض نے "کسی آیت کا حکم" سے ترجمہ کیا ہے۔ اس میں "حکم" کا اضافہ بھی تفسیری ہے۔ دوسری صورت (تنصیص) میں اس کا ترجمہ "کوئی بھی آیت/ جس بھی آیت کو/ کسی بھی آیت کو" ہونا چاہئے۔ اکثر مترجمین نے "بھی" کے بغیر صرف "کوئی آیت/ کسی آیت" سے ترجمہ کیا ہے جو بظاہر صرف لفظ "آیۃ" کا ترجمہ لگتا ہے۔ تنصیص کے مفہوم کے لئے اُردو میں "بھی" کا لانا ضروری تھا' تاہم "کسی یا کوئی" میں نکرہ کا مفہوم آگیا ہے۔ بعض نے صرف "جو آیت/ جس آیت" سے ترجمہ کیا ہے جس میں نہ تبعیض کا مفہوم ہے نہ تنصیص والی تاکید اور قطعیت کا۔ دوسرا لفظ "آیۃ" ہے جس کا مادہ "أ ی ی" اور وزن اصلی (غالباً) "فَعَلَۃٌ" ہے۔ اس پر مفصل بحث البقرہ :۳۹ [۲: ۲: ۱(۵)] میں گزر چکی ہے۔ اس لفظ کے قرآنی ضبط پر آگے بات ہوگی' کیونکہ یہاں جو ہم نے اسے "آ" کے ساتھ لکھا ہے یہ عام املائی رسم ہے۔

۴ [اَوْ نُنْسِهَا] یہ دراصل تین کلمات اَوْ + نُنْسِ + هَا کا مرکب ہے۔ ان میں سے "اَوْ" (بمعنی "یا") کے استعمال پر البقرہ :۱۹ [۲: ۱۴: ۱(۱)] میں بات ہو چکی ہے۔ آخری لفظ "هَا" ضمیر واحد مؤنث غائب (بمعنی "اس کو") ہے---- اور کلمہ "نُنْسِ" کا مادہ "ن س ی" اور وزن اصلی "نُفْعِلُ" ہے۔ یعنی یہ بابِ افعال سے فعل مضارع مجزوم کا صیغہ جمع متکلم ہے (جزم کی وجہ آگے "الاعراب" میں آئے گی) یہ اصل میں "نُنْسِیُ" تھا۔ جزم کی وجہ سے "نُنْسِیْ" ہوگیا اور ناقص مجزوم کے قاعدے کی بنا پر آخری "ی" گر کر اس کی (استعمالی) صورت "نُنْسِ" ہوگئی جس کا وزن اب "نُفْعِ" رہ گیا ہے۔

● اِس مادہ سے فعل مجرد "نَسِیَ یَنْسَی" (بھول جانا' ترک کرنا) کے باب اور معانی و استعمال پر البقرہ :۴۴ [۲: ۲۹: ۱(۸)] میں مفصل بات ہو چکی ہے (کلمہ تَنْسَوْنَ کے ضمن میں)۔

● اس سے بابِ افعال کے فعل اَنْسٰی یُنْسِی اِنْساءً" (دراصل اَنْسَیَ یُنْسِیُ اِنْسَایًا) کے معنی ہیں: بھلا دینا' ذہن سے اُتار دینا' فراموش کر دینا۔ اس متعدی فعل کے ہمیشہ دو مفعول اور دونوں بنفسہٖ (منصوب) آتے ہیں۔ پہلا مفعول وہ شخص ہوتا ہے جس کو بھلا دیا جائے یا اس کے ذہن سے اُتار دیا جائے---- دوسرا مفعول وہ چیز یا بات ہوتی ہے جو اس (شخص) کو بھلا دی جائے اور جس کو اس (شخص) کے ذہن سے اُتار دیا جائے۔ مثلاً کہتے ہیں "اَنْسَی الرَّجلَ

الشیءَ" (اس نے آدمی کو چیز بھلا دی' فراموش کرا دی) اور قرآنِ کریم میں ہے نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ (الحشر:۱۹) یعنی "وہ بھول گئے اللہ کو تو اس نے بھلا دیئے ان کو ان کے (اپنے) نفس (جانیں)۔"

● بعض دفعہ اس فعل کا ایک مفعول محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے جو سیاق عبارت سے سمجھا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس فعل (اَنْسٰی یُنْسِی) کے مختلف صیغے سات جگہ آئے ہیں اور ان میں سے چھ مقامات پر دونوں مفعول مذکور ہوئے ہیں۔ صرف ایک (زیر مطالعہ) آیت میں پہلا مفعول محذوف ہے۔ گویا یہاں "نُنْسِھَا" دراصل "نُنْسِکَھَا" سمجھا جائے گا (یعنی ہم بھلا دیتے ہیں تجھ کو وہ) اور "وہ" (ھَا) سے مُراد آیت ہے جو پہلے مذکور ہے۔ اور یہاں مقدر (محذوف) ضمیر منصوب (کَ) بظاہر مخاطب اول (رسول اللہ ﷺ) کے لئے ہے۔

● اِس طرح "اَوْنُنْسِھَا" کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "یا ہم بھلا دیتے ہیں (تجھے) اس کو/ یا ہم اُتار دیتے ہیں (تیرے) ذہن سے اس کو/ یا ہم فراموش کرا دیتے ہیں (تجھے/ ذہنوں سے) اس کو"... جسے اکثر مترجمین نے "بھلا دیتے ہیں" سے ترجمہ کیا ہے۔ ایک آدھ نے "بھلا دیں" (بصورتِ مضارع) کیا ہے۔ بعض نے "فراموش کرنا/ کرانا" استعمال کیا ہے اور ایک نے "ذہن سے اُتار دینا" سے کام لیا ہے۔

● سوائے ایک مترجم کے سب نے "نُنْسِ" میں مستتر ضمیر (نَحْنُ = ہم) کا ترجمہ نہیں کیا' بلکہ سابقہ فعل "نَنْسَخْ" کے ترجمہ میں "ہم" کے استعمال کو کافی سمجھا ہے۔ اسی طرح یہاں منصوب ضمیر مفعول (ھَا) کا ترجمہ بھی (غالباً محاورے کی بنا پر) اکثر نے نظرانداز کر دیا ہے۔ اور سابقہ لفظ "آیت" (مِنْ آیۃٍ) کے ذکر پر اکتفا کیا ہے (کیونکہ یہ ضمیر (ھَا) اسی (آیۃ) کے لئے ہے۔ صرف ایک دو مترجمین نے اس کے لئے ترجمہ میں "اس کو/اسے" کا اضافہ کیا ہے۔ اور بعض نے دوبارہ لفظ آیت استعمال کرتے ہوئے اس "ھَا" کا ترجمہ "اس آیت (ہی) کو" کی صورت میں کیا ہے۔ اسی طرح مقدر (غیر مذکور) مفعول اول کا ذکر بھی قریباً سب نے نظرانداز کیا ہے۔ صرف ایک آدھ نے اس کے لئے قوسین میں بطور وضاحت (تمہارے) اور ایک نے (ذہنوں سے) کے ساتھ ترجمہ کیا ہے... بلحاظ مفہوم سب تراجم یکساں ہیں۔

۲ : ۶۴ : ۱(۲) [نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَآ اَوْ مِثْلِھَا] یہ تمام کلمات بھی پہلے گزر چکے ہیں' اس لئے یہاں ہر ایک کا مختصراً ذکر اور گزشتہ حوالہ کافی ہوگا۔

❶ "نَاْتِ" جس کا مادہ "ا ت ی" اور وزن اصلی "نَفْعِلُ" ہے' یہ ثلاثی مجرد کے فعل

"أَتَى يَأْتِي" (دراصل أَتَيَ يَأْتِيُ) سے فعل مضارع مجزوم کا صیغہ جمع متکلم ہے جو ابھی اُوپر مذکور کلمہ "نُنْسِ" کی طرح تعلیل ہو کر نَأْتِيُ = نَأْتِيْ=نَأْتِ بنا ہے اور اب اس کا وزن "نُفْعِ" رہ گیا ہے۔ اس فعل مجرد (أَتَى يَأْتِي) کے باب' معانی اور استعمال پر مفصل بات البقرہ : ۲۳ [۲ : ۱۷ : ۱ (۴)] میں کلمہ "فَأْتُوا" کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ یہاں اس کا ترجمہ "بِ" کے صلہ کی بناء پر (جو اگلے کلمہ "بِخَيْرٍ" کے شروع میں ہے) یعنی "نَأْتِ بِ ..... = تو ہم لاتے ہیں" --- ہوگا۔

❷ "بِخَيْرٍ" ابتدائی "بِ" تو فعل "نَأْتِ" کا صلہ ہے (جس سے فعل أَتَىٰ بِ .... "لے آنا" کے معنی دیتا ہے) اور کلمہ "خَيْر" یہاں افعل التفضیل کے معنی میں ہے' یعنی "بہتر' زیادہ اچھا/ اچھی"--- اس لفظ (خَير) کے معنی اور استعمال پر البقرہ :۵۴ [۲ : ۳۴ : ۱ (۵)] میں بات ہو چکی ہے۔

❸ "مِنْهَا" جو دو کلمات (مِنْ + هَا) کا مرکب ہے' اس میں من یہاں "تفضیلیة" ہے اور مجاوزۃ (آگے نکلنا) کا مفہوم دیتی ہے۔ دیکھئے البقرہ :۳ [۲ : ۲ : ۱ (۵)] اور هَا ضمیر مؤنث واحد غائب بمعنی "اس" ہے۔ یوں "مِنْهَا" کا ترجمہ ہوا "اس سے/ اس کے مقابلے پر/ اس کی نسبت۔"

❹ "أَوْ مِثْلِهَا" یہ بھی (اُوپر مذکور "أَوْ نُنْسِهَا" کی طرح) دراصل تین کلمات "أَوْ + مِثْلِ + هَا کا مرکب ہے۔ "أَوْ" (بمعنی "یا") مختلف مفہوم دیتا ہے۔ دیکھئے :البقرہ :۱۹ [۲ : ۱۴ : ۱ (۱)] "مِثْل" کا ترجمہ "مانند' جیسا' ہم پلہ' برابر" اور "کی مثل" بھی ہو سکتا ہے۔ اس لفظ کے مادہ' معنی اور استعمال پر البقرہ :۲۳ [۲ : ۱۷ : ۱ (۶)] میں بات ہوئی تھی۔ اور ضمیر مجرور (ها) کا ترجمہ "اس کی/ کا" ہے مگر مثل کے ساتھ مل کر اس (مثلها) کا ترجمہ "اس جیسی' ویسی ہی" کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اگرچہ بعض نے "مثل اس کے' اس کے برابر اور ان کی مانند" (آیت کو بمعنی جمع لے کر) بھی کیا ہے اور بعض نے صرف ضمیر کی بجائے اس کے مرجع کو بھی ساتھ لے کر ترجمہ "اس آیت ہی کی مثل" سے بھی کیا ہے۔ مفہوم سب کا ایک ہے۔

● یوں اِس حصہ آیت (نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ أَوْ مِثْلِهَا) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "تو (اس "تو" کی وجہ آگے "الاعراب" میں بیان ہوگی) ہم لاتے/ لے آتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر/ اس کی مثل/ مثل اس کی/ اس جیسی/ ویسی ہی۔" زیادہ تر مترجمین نے ان ہی مذکور متبادل الفاظ کے ساتھ ترجمہ کیا ہے' البتہ اُردو عبارت کی ساخت کے اعتبار سے فعل کا ترجمہ جملے کے آخر پر لائے ہیں۔ البتہ بعض نے بصورت مستقبل ترجمہ "لائیں گے" کے ساتھ کیا ہے' جس

کی لحاظ سیاقِ عبارت چنداں ضرورت نہ تھی۔ بعض مترجمین نے "نَاْتِ بِ....." کا ترجمہ "پہنچاتے' بھیج دیتے/ نازل کر دیتے ہیں" کی صورت میں کیا ہے جو بلحاظ مفہوم درست ہے' اگرچہ لفظ سے قدرے ہٹ کر ہے۔ بعض نے ضمیر "ھَا" کا ترجمہ دونوں جگہ (مِنْھَا اور مِثْلِھَا) ضمیر کے مرجع "آیۃ" (کے اسم ظاہر) کے ساتھ کیا ہے یعنی "اس آیت سے بہتر یا اس آیت ہی کی مثل" کی صورت میں---- اور بعض نے "مِثْلِھَا" کا ترجمہ "ویسی ہی اور آیت" سے کیا ہے۔ یہ سب وضاحتی یا تفسیری ترجمے ہیں' ورنہ ضمیر کا بصورتِ ضمیر ترجمہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں' بلکہ اکثر نے یہی کیا ہے۔

● زیر مطالعہ آیت کے اس حصہ میں (جس پر ابھی دو حصے کر کے بات ہوئی ہے' یعنی "مَا نَنْسَخْ ..... نُنْسِھَا" اور "نَاْتِ ..... مِثْلِھَا" کی صورت میں) اس کے مجموعی ترجمے میں یہ جو کسی آیت کو منسوخ کرنے یا بھلا دینے اور پھر ویسی ہی بلکہ اس سے بہتر آیت لانے کا ذکر ہے (اور قرآنِ کریم کی ایک اور آیت "وَاِذَا بَدَّلْنَا اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ..... الخ (النحل :۱۰۱) میں بھی یہی مضمون ہے)۔ اس کا تعلق "نسخ فی القرآن" کی مشہور بحث سے ہے اور اس موضوع پر مستقل تصانیف بھی ہیں (جن میں ایک مصری عالم ڈاکٹر مصطفیٰ زید کی ایک ہزار صفحات پر مشتمل دو جلدوں میں شائع شدہ کتاب "النسخ فی القرآن" قابل ذکر ہے) اور تفسیری مباحث بھی----- جن میں بہت کچھ افراط اور تفریط سے بھی کام لیا گیا ہے۔ بہرحال "نسخ" کی اصطلاحی تعریف (کسی حکم کو ہمیشہ کے لئے اور ہر شخص کے لئے ختم کر دینا) کے مطابق اور ان معنوں میں قرآنِ کریم کی کوئی آیت مطلقاً منسوخ نہیں ہے۔ جزوی اور وقتی نسخ کے لئے الگ اصطلاحات (عام' خاص' مطلق' مقید وغیرہ) بھی موجود ہیں۔ اس بناء پر اس پیچیدہ بحث کے لئے کسی اچھی اور معتمد علیہ تفسیر یا اصول تفسیر یا علوم القرآن کی کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب "الکفوز الکبیر" میں اس پر بہت عمدہ بحث کی گئی ہے' جو اہل علم کے لئے تحقیق اور تفہیم کے نئے راستے بھی کھولتی ہے۔

۲ : ۶۴ : ۱(۳) [اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ]

❶ "اَلَمْ تَعْلَمْ" کا ابتدائی ہمزہ (اَ) استفہام کے لئے ہے (بمعنی "کیا"؟) ہمزۂ استفہام سیاق و سباقِ عبارت کے مطابق متعدد مفہوم دیتا ہے۔ اس کے بعض استعمالات البقرہ :۶ [۲:۵:۱(۳)] نیز البقرہ :۴۴ [۲:۲۹:۱(۵)] میں بیان ہوئے تھے۔ یہاں یہ تعجب یا تقریر (اقرار) کا مفہوم دیتا ہے' اور اگلا لفظ "لَمْ تَعْلَمْ" فعل علم یعلم بمعنی "جاننا' جان لینا" سے صیغہ مضارع منفی

بِلَمَ ہے۔ فعل "عَلِم" کے معنی و استعمال پر [۱ : ۲ : ۱ (۴)] اور [۲ : ۱۰ : ۱ (۳)] میں بات ہوئی تھی۔ اور فعل مضارع پر "لَمْ" کے استعمال اور اس کے اثر پر البقرہ : ۳۳ [۲: ۲۳: ۱ (۲)] میں (اَلَمْ اَقُلْ کے ضمن میں) بات ہوئی تھی کہ لَمْ مضارع کو بلحاظ صورت جزم دیتا ہے اور بلحاظ معنی اسے ماضی منفی مع جحد (بزور انکار) بنا دیتا ہے۔ اس طرح یہاں "اَلَمْ تَعْلَمْ" کا ترجمہ بنتا ہے "کیا تُو نے جانا ہی نہیں؟" اسی کو بعض نے "کیا نہ جانا تو نے؟" اور "کیا تم نہیں جانتے؟" سے ترجمہ کیا ہے جبکہ بعض نے اسے مزید بامحاورہ اور سلیس کرتے ہوئے "کیا تجھ کو/ تم کو/ تجھے/ تمہیں معلوم نہیں/ خبر نہیں" کی صورت دی ہے۔ لفظ "معلوم" فعل "عَلِمَ" سے اسم المفعول ہے اور اُردو میں رائج اور معروف ہے۔

❷ "اَنَّ اللّٰهَ" (کہ بیشک اللہ تعالیٰ)۔ یہ "اَنَّ" بھی "اِنَّ" کی اخوات (بہنوں) یعنی "اِنَّ اَنَّ كَاَنَّ لَيْتَ لٰكِنَّ و لَعَلَّ" میں سے ایک ہے' جو حروفِ مشبّہ بالفعل بھی کہلاتے ہیں اور جو سب اپنے اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتے ہیں۔ ہر ایک پر بات اپنے موقع پر ہوگی۔ "اَنَّ" پر مختصراً بات البقرہ :۶ [۲: ۵: ۱] میں ہوئی تھی۔ "اِنَّ" اور "اَنَّ" دونوں کے معنی یکساں ہیں (بے شک' یقیناً' بلاشبہ' تحقیق) البتہ ان کے موقع استعمال میں فرق ہوتا ہے۔ گرامر کی بڑی کتابوں میں تو ان کے مواقع استعمال کے لمبے چوڑے قواعد لکھے ہوتے ہیں' مثلاً یہ کہ دس مواقع ایسے ہیں جہاں لازماً "اِنَّ" (بکسر ہمزہ) آتا ہے۔ اور آٹھ مواقع ایسے ہیں جہاں لازماً "اَنَّ" (بفتح ہمزہ) آتا ہے اور نو کے قریب ایسے مواقع ہیں جہاں "اِنَّ اَنَّ" دونوں طرح استعمال ہو سکتے ہیں۔[1]

آپ مختصراً اتنا یاد رکھیں کہ کسی جملے کی ابتدا میں تو ہمیشہ "اِنَّ" ہی استعمال ہوتا ہے' مگر جملے کے درمیان میں "اَنَّ" آتا ہے۔ البتہ فعل "قَالَ يَقُوْلُ" کے کسی صیغے کے بعد درمیانِ کلام بھی "اِنَّ" آئے گا۔ مثلاً "اَشْهَدُ اَنْ....." آتا ہے مگر "اَقُوْلُ اِنَّ....." کہیں گے۔ اس فرق کی وجہ سے ہی "اِنَّ" کا ترجمہ تو "بے شک اور یقیناً" کرتے ہیں مگر "اَنَّ" کا ترجمہ "کہ بیشک۔ کہ یقیناً" کیا جاتا ہے۔ بلکہ اُردو محاورے میں تو بعض دفعہ صرف "کہ" پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے' جیسا کہ اس (زیر مطالعہ) موقع پر اکثر مترجمین نے کیا ہے۔

● اسم جلالت (اللّٰہ) کے بارے میں لغوی بحث "بسم اللّٰہ" یعنی [۱: ۱: ۲] میں گزری ہے۔

❸ "عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" (ہر چیز پر ہر وقت اور ہر طرح سے قدرت رکھنے والا ہے)۔ اس عبارت (کے تمام کلمات) پر البقرہ :۲۰ [۲: ۱۵: ۱ (۱۰-۱۱)] میں بحث ہو چکی ہے۔ اور یہی

---

(۱) مثلاً چاہیں تو دیکھ لیجئے معجم النحو' ص ۶۹ تا ۷۴

عبارت قرآنِ کریم میں قریباً ۳۵ مقامات پر آئی ہے۔ یہاں (اور باقی جگہوں پر بھی) اکثر نے ترجمہ "ہر چیز پر قادر ہے" سے کیا ہے۔ اُردو محاورہ کے لحاظ سے یہ ترجمہ درست ہے۔ تاہم ہم نے اُوپر جو ترجمہ لکھا ہے وہ قَادِرٌ (اسم الفاعل) اور قَدِیر (الصفة المشبهة) کے فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ شاید اسی لئے اُردو کے بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ "قدرت رکھتا ہے" اور "سب کچھ کر سکتا ہے" سے کیا ہے۔

● [اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ] بعینہٖ یہی عبارت ابھی اُوپر ❶ اور ❷ میں گزری ہے' لفظی ترجمہ ہے "کیا تُو نے جانا ہی نہیں کہ بیشک اللہ تعالیٰ"۔ بامحاورہ اور سلیس تراجم اُوپر دیکھئے۔

۲ : ۶۴ : ۱ (۴) [لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ] (اس ہی کے لئے ہے بادشاہی/ سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی)

❶ "لَهٗ" یہ لام الجر (لِ) + (ہ) ضمیر مجرورہ ہے۔ لام الجر ضمیروں کے ساتھ مفتوح (لَ) آتا ہے۔ اِس لام (لِ) کے مختلف معانی و استعمالات پر الفاتحہ :۲ [۱: ۲: ۱ (۲)] میں بات ہوئی تھی۔ یہاں یہ "کے لئے' کا (حق)' کی (ملکیت)" کے معنی میں آیا ہے۔ اس لئے اس کا ترجمہ "واسطے اس کے ہے/ اس ہی کے لئے ہے/ اسی کی ہے/ اسی ہی کی ہے" کی صورت میں کیا گیا ہے اور چونکہ اس سے پہلے "اَنَّ اللّٰهَ" آیا ہے اور "لَهٗ" کی ضمیر اللہ کے لئے ہے اس لئے مترجمین نے محاورے کے مطابق اللہ کے ساتھ "اس" کو جمع نہیں کیا بلکہ "اس" کی بجائے اسمِ جلالت "اللّٰہ" لگا کر ترجمہ کیا ہے' یعنی "اللہ ہی کے لئے/ اللہ ہی کی" کی صورت میں اور "ہی" لگانے کی وجہ "لہ" کا پہلے آنا ہے۔ اس پر مزید بات "الاعراب" میں ہوگی۔

❷ "مُلْكُ" جو یہاں مضاف ہے' کا مادہ "م ل ك" اور وزن "فُعْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "مَلَكَ یَمْلِكُ = مالک ہونا" کے معانی باب اور استعمال پر الفاتحہ :۴ [۱: ۳: ۱ (۱)] میں بات ہوئی تھی اور پھر البقرہ :۱۰۲ [۲: ۶۲: ۲ (۱)] میں خود یہی لفظ (مُلْكُ) پہلی دفعہ گزر چکا ہے۔ یہ لفظ مفرد مرکب معرفہ نکرہ مختلف حالتوں میں قرآنِ کریم کے اندر پچاس کے قریب مقامات پر آیا ہے اور اس کے بنیادی معنی میں قوت' قبضہ اور حکم کا مفہوم ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ "بادشاہی' حکمرانی' سلطنت' اقتدار" کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے مذکور ہو تو اس کے معنی "حقیقی بادشاہی اور اقتدارِ اعلیٰ" کے ہوتے ہیں۔

❸ "السَّمٰوٰتِ" جس کا مادہ "س م و" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فَعَالات" ہے۔ یہ "السَّماء" (آسمان) کی جمع مؤنث سالم ہے۔ لفظ "السَّماء" (واحد) پر بات البقرہ :۱۹ [۲:

۱۴:۱(۳)] میں ہوئی تھی اور "سمٰوٰت" (جمع نکرہ) کا لفظ پہلی دفعہ البقرہ :۲۹[۲:۲۰:۱(۱۰)] میں زیر بحث آیا تھا۔ (سَبْعَ سمٰوٰتٍ کے ضمن میں)۔ "السمٰوٰت" کا اُردو ترجمہ "آسمانوں" ہے۔

۴ "وَالْاَرْضِ" میں "و" تو عاطفہ (بمعنی "اور") ہے اور لفظ "الارض" (بمعنی "زمین") کے مادہ اور معنی وغیرہ پر پہلی دفعہ البقرہ :۱۱[۲:۹:۱(۴)] میں مفصل بات ہو چکی ہے۔

● اِس طرح اس پوری عبارت (اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) کو ملا کر اس کا بامحاورہ و سلیس ترجمہ (لفظی ترجمے اُوپر لکھ دیئے گئے ہیں) "لہ" کی ضمیر "ہ" کی بجائے اس کے مرجع "اللّٰہ" کو استعمال کرتے ہوئے "اللہ / ہی کو / ہی کے لئے / ہی کو / ہے بادشاہی / سلطنت / بادشاہت / آسمانوں اور زمین کی" کی صورت میں کیا گیا ہے۔ بعض نے اُردو جملے کے ساخت کو ملحوظ رکھتے ہوئے "آسمان / آسمانوں اور زمین کی سلطنت / بادشاہت اسی اللہ کی / خدا ہی کی ہے" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے "اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ" کی ترکیب کی وجہ سے ترجمہ "کہ حق تعالیٰ (اللہ) ایسے ہیں کہ خاص ان ہی کی ہے....." کی صورت میں کیا ہے۔ تمام تراجم کا مفہوم یکساں ہے۔

۲ : ۶۴ : ۱(۵) [وَمَالَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ....] اس حصہ عبارت کے تمام کلمات بھی پہلے گزر چکے ہیں۔ ہر ایک کی مختصراً وضاحت یوں ہے :

۱ "وَ" کا ترجمہ تو "اور" ہی سے ہوگا۔ تاہم یہ "و" استیناف کے لئے ہے کیونکہ یہاں سے ایک نیا مضمون شروع ہوتا ہے۔ اور اسی لئے اس سے سابقہ جملے کے آخر پر وقف مطلق "ط" لکھا گیا ہے۔ مستانفہ واو (یا واو الاستیناف) پر البقرہ :۸[۲:۷:۱(۱)] میں مفصل بات ہوئی تھی۔

۲ "مَا" (نہیں ہے)۔ یہاں "مَا" نافیہ مشابہ بِلَیْسَ ہے' جسے "مَا الحِجازیة" بھی کہتے ہیں' دیکھئے البقرہ :۳[۲:۲:۱(۵)]۔

۳ "لَكُمْ" (تمہارے لئے' تمہارا' تمہارے واسطے) اس میں ضمیر مجرور (کم) بمعنی "تم" سے پہلے لام الجر (لِ) ہے جو ضمیر کی وجہ سے مفتوح ہے۔ لام الجر کے مختلف معانی پر الفاتحہ :۱[۱:۲:۱(۲)] بات ہوئی تھی۔

۴ "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" (اللہ کے سوا / کے بغیر / کے مقابلے پر) بعینہٖ یہی ترکیب البقرہ : ۲۴ [۲ : ۱۷ : ۱(۹)] میں گزر چکی ہے۔ وہاں "دُوْنَ" کے بطور ظرف مضاف (جو اکثر مجرور "بِمِنْ" بھی آتا ہے) کے استعمال اور اس کے ۱۲ مختلف معانی پر بات ہوئی تھی۔ یہ لفظ (دُوْن)

مختلف تراکیب میں (اور زیادہ تر مجرور "بِمِن" ہو کر) قرآنِ کریم میں ۹۲ مقامات پر آیا ہے۔

● اِس طرح اس حصّہ عبارت (وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللّٰه) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "اور نہیں ہے تمہارے لئے سوائے اللہ کے" جسے زیادہ تر نے "اللہ کے سوا" اور بعض نے "خدا کے سوا" یا "حق تعالیٰ کے سوا" سے ترجمہ کیا ہے۔ "واسطے تمہارے / تمہارے لئے" کو اکثر نے "تمہارا" کی سلیس اور بامحاورہ شکل دی ہے۔ بعض نے "تم مسلمانوں کا" سے ترجمہ کیا ہے جسے تفسیری ترجمہ کہہ سکتے ہیں۔

۲ : ۶۴ : ۱ (۶) [..... مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ] یہ حصّہ عبارت سابقہ (مندرجہ بالا) عبارت کے ساتھ (بلحاظ ترکیب جملہ) مربوط ہے۔ اِسی لئے اُس عبارت کے آخر پر اور اِس عبارت کے شروع میں نقطے (.......) ڈالے گئے ہیں۔ اِس (زیرِ مطالعہ) عبارت کے بھی سب الفاظ بلحاظ "مادہ" تو پہلے گزر چکے ہیں' البتہ بلحاظ ساخت و اشتقاق دو لفظ "وَلِیّ" اور "نَصِیر" نئے ہیں' لہٰذا ان کی وضاحت ضروری ہے۔ تفصیل یوں ہے :

❶ "مِنْ" یہاں تنصیصِ نکرہ کے لئے ہے' یعنی اس سے نکرہ میں مزید عموم اور تاکید کا مفہوم ہوتا ہے۔ دیکھئے البقرہ :۳ [۲ : ۲ : ۱ (۵)] اسے "مِن زائدہ" بھی کہتے ہیں' اس کی وجہ سے اگلے لفظ (وَلِی اور نَصِیر) سے پہلے ترجمہ میں "کوئی بھی" لگے گا۔

❷ "وَلِیّ" کا مادہ "و ل ی" اور وزن "فَعِیل" ہے (جو یہاں مجرور آیا ہے) گویا یہ لفظ دراصل "وَلِيْيٌ" تھا جس میں آخری دو "ی" (یْ ی) مدغم ہو کر "یّ" بن گئی ہیں۔

● اس مادہ سے فعل مجرد "وَلِيَ يَلِي = قریب ہونا' آس پاس ہونا" پر البقرہ:۶۴ [۲:۴۱:۱(۳)] میں بات ہوئی تھی۔ یہ لفظ (وَلِیّ) اس فعل مجرد سے صفت مشبہ کا صیغہ بھی ہو سکتا ہے اور اسم مبالغہ بھی۔ پہلی صورت میں اس کا مطلب ہوگا "ہر وقت' ہر جگہ قریب اور پاس" اور دوسری صورت میں اس کا مطلب ہوگا "بہت زیادہ قریب اور پاس"--- اسی لئے اس لفظ کا ترجمہ "دوست / یار / حمایتی / حامی" کی صورت میں کیا گیا ہے۔ اور اس کا ترجمہ "سرپرست / کارساز" بھی ہو سکتا۔ ان سب الفاظ میں بنیادی مفہوم "قرب اور نزدیکی" کا ہے' چاہے وہ بلحاظ مکان (جگہ) ہو یا بلحاظ نسب یا بلحاظ دین یا بلحاظ حمایت اور دوستی ہو--- لفظ "وَلِیّ" قرآنِ کریم میں مفرد مرکب معرفہ نکرہ مختلف اعرابی حالتوں میں ۴۴ جگہ استعمال ہوا ہے اور اکثر جگہ اللہ تعالیٰ کو اہل ایمان کا "وَلِیّ" کہا گیا ہے۔ اسی لفظ کی جمع مکسر "اَولیاءُ" (غیر منصرف) ہے اور یہ لفظ بھی قرآنِ کریم میں چالیس سے زائد جگہ وارد ہوا ہے۔

❸ "وَلَا" (اور نہ ہی) "وَ" بمعنی "اور" کئی دفعہ گزر چکا ہے اور "لَا" بمعنی "نہ / نہیں" یہاں "مَا نافیہ" کے بعد آیا ہے' لہٰذا "نفی" کے مفہوم کی تکرار کے باعث اس کا اُردو میں صحیح مفہوم "نہ" کے بعد "ہی" لگانے سے واضح ہو سکتا ہے۔

❹ "نَصِیر" (مددگار)۔ جس کا مادہ "ن ص ر" اور وزن "فَعِیل" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "نصَر ینصُر = مدد کرنا" کے باب اور معنی وغیرہ پر البقرہ :۴۸ [۲:۳۱:۱(۷)] میں بات ہوئی تھی۔ خیال رہے "نصَر" کا اصل مفہوم ایسی مدد کرنا ہوتا ہے جو آدمی کو (دشمن وغیرہ کے مقابلے پر) کامیاب کر دے۔ لفظ "نَصِیر" اس فعل سے اسم المبالغہ کا صیغہ ہے (عموماً صفت مشبہ فعل لازم سے اور اسم مبالغہ فعل متعدی سے آتا ہے)۔ اُردو میں قریباً سب نے ہی اس کا ترجمہ "مددگار" کیا ہے۔

● یوں اتنی عبارت (..... مِن وَلِیٍّ وَّلَا نَصِیر) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "..... کوئی بھی دوست اور نہ ہی کوئی مددگار"۔ جیسا کہ ابھی مذکور ہوا لفظ "وَلِیّ" کا ترجمہ بعض دوسرے الفاظ (حمایتی' حامی' کارساز' سرپرست وغیرہ) سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ نَصِیر کا ترجمہ "مدد والا" بھی کیا گیا ہے جو خالص اُردو ترکیب ہے۔ اکثر نے یہاں "مِنْ" کے ترجمہ میں "کوئی" کے ساتھ "بھی" کو اور "وَلَا" کے ترجمہ میں "نہ" کے ساتھ "ہی" کو نظرانداز کیا ہے۔ البتہ بعض نے نکرہ (کوئی) کی تکرار کو ملحوظ رکھ کر ترجمہ "نہ کوئی دوست ہے نہ کوئی مددگار" کوئی نہیں حامی اور نہ کوئی مددگار" کی صورت میں کیا ہے اور بعض نے (شاید اُردو محاورہ کی خاطر) ایک جگہ "کوئی" اور دوسری جگہ "نہ" کا استعمال کیا ہے۔ یعنی "کوئی دوست اور نہ مددگار / کوئی حمایتی ہے اور نہ مددگار / کوئی حمایتی اور نہ مددگار" کی صورت میں۔ جبکہ بعض حضرات نے اُردو جملے کی ساخت کا لحاظ رکھتے ہوئے سابقہ عبارت (وَمَالَكُمْ مِنْ دُونِ اللّٰه) کے "مَا" کا ترجمہ آخر پر بصورت "نہیں" لائے ہیں۔ مثلاً "کوئی یار و مددگار بھی نہیں / کوئی دوست / یار و مددگار نہیں" کی صورت میں---- تمام تراجم کا مفہوم یکساں ہے۔ البتہ جس نے "کوئی بھی / نہ ہی" کے ساتھ یا "کوئی" اور "نہ" کی تکرار سے ترجمہ کیا ہے وہ اصل سے قریب تر ہے۔

بقیہ : حواشی از صفحہ ۴۴

{۷۳} ابوداؤد' امام' سنن ابی داؤد' کتاب اللباس' جلد ششم' ص ۲۴

{۷۴} ایضاً جلد پنجم' ص ۲۸۴' کتاب الاشربہ باب الشرب

{۷۵} انسان کامل' ڈاکٹر خالد علوی

{۷۶} خطیب طبریزی' مشکوٰۃ المصابیح' ص ۴۵۹' مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی {۷۷} ایضاً' ص ۴۵۶

فصلِ بہار

قرآن اکیڈمی میں قرآنی علوم و معارف کے انوار کی بارش

جمیل الرحمٰن

نومبر ۹۷ء کے حکمت قرآن میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی پچیس سالہ رپورٹ شائع کی گئی تھی۔ رپورٹ کی اشاعت کے بعد کراچی سے محترم شیخ جمیل الرحمن صاحب نے توجہ دلائی کہ اس مفصل رپورٹ میں دورۂ ترجمہ قرآن کا ذکر موجود نہیں ہے' جسے دعوت رجوع الی القرآن کے ایک اہم سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس تسامح کی کسی قدر تلافی کے طور پر ذیل میں محترم شیخ صاحب ہی کی مرتب کردہ دورۂ ترجمہ قرآن کے اولین پروگرام کی رپورٹ شائع کی جا رہی ہے' جو اگست ۱۹۸۴ء کے "میثاق" میں شائع ہوئی تھی۔

امت مسلمہ اس امر پر متفق ہے اور اس پر اجماع ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر سب سے پہلی وحی سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کی شکل میں نازل ہوئی : ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ○﴾ ان آیات میں دو مرتبہ لفظ اِقْرَاْ آیا ہے جس کے معنی ہیں "پڑھ"۔ قَرَاَ یَقْرَاُ سے یہ فعل امر ہے۔ اسی سے فعلان کے وزن پر لفظ "قرآن" بنا۔ یعنی "سب سے زیادہ پڑھی جانے والی شے"۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے اس وصف اور اسم صفت ہی کو اپنی کتاب مبین کا سب سے زیادہ مشہور و معروف بلکہ اسم علم "القرآن" قرار دے دیا۔ اس کتاب حمید کے متعدد صفاتی نام اور بھی ہیں' لیکن اس کا اسم علم "القرآن" ہی ہے اور پوری دنیا یہ تسلیم کرتی ہے جس میں یگانے بھی شامل ہیں اور بیگانے بھی' جس میں اس کتاب پر ایمان رکھنے والے بھی ہیں اور اس کے وحی الٰہی ہونے کے منکر بھی کہ قرآن ہی دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ یہ شرف صرف قرآن ہی کو حاصل ہے کہ یہ کتاب اس پر ایمان رکھنے والوں میں سے لاکھوں انسانوں کے سینوں میں محفوظ ہے اور دنیا میں جہاں بھی معتدبہ تعداد میں مسلمان بستے ہیں وہاں ہر سال رمضان المبارک میں ہزاروں حفاظ تراویح میں پورا قرآن سناتے ہیں اور لاکھوں سے بھی متجاوز قرآن کی تلاوت سنتے ہیں۔ ان

خصوصیات میں کوئی کتاب بھی قرآن مجید کی شریک و سہیم نہیں ہے۔

لیکن اپنی جگہ یہ بھی واقعہ ہے جو حد درجہ افسوسناک بھی ہے کہ اول تو اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان رکھنے والوں کی عظیم اکثریت عربی زبان سے نابلد ہے' جبکہ قرآن حکیم کی زبان عربی ہے۔ دوسرے یہ کہ جن کی زبان عربی ہے یا جو عربی سے بخوبی واقف ہیں' ان کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو محض ایک کتاب مقدس کا مقام دے رکھا ہے اور وہ محض اس کی تلاوت و قراءت پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور اسی کو باعث اجر و ثواب سمجھتے ہیں' جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ ھُدًی لِلنَّاسِ ہے۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو' کوئی گوشہ اور کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کیلئے اس کتاب الٰہی میں ہدایت و رہنمائی موجود نہ ہو۔ اس کے نزول کا اولین مقصد یہ ہے کہ قرآن کے اصولوں پر مبنی نظام اجتماعی قائم اور نافذ کیا جائے۔ مسلمان بحیثیت مسلمان اس دنیا میں عزت و وقار حاصل کر ہی نہیں سکتا جب تک وہ بحیثیت امت و ملت اس قرآن کو عملی طور پر اپنا ہادی و امام نہ بنا لے اور اس کتاب ہدایت کے مطابق اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو استوار نہ کر لے۔ بقول علامہ اقبال ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

بحمد اللہ ہر دور میں ایسے رجال دین پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے اور اس فرقان حمید پر عمل کرنے کی دعوت دینے کیلئے اپنی زندگیاں کھپا دیں اور کھپا رہے ہیں۔ ان ہی خوش بخت حضرات میں ڈاکٹر اسرار احمد بھی ایک خادم قرآن مجید کی حیثیت سے شامل ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے یہ توفیق بخشی کہ انہوں نے دعوت رجوع الی القرآن کو ایک تحریک کی شکل میں بپا کرنے کیلئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے اور وہ کتاب و سنت کی اساسات پر اسلامی انقلاب برپا کرنے کیلئے اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں۔

اللہ رب العزت جو "نِعم المولیٰ" اور "نِعم النصیر" ہے اس کی تائید و نصرت کا مظہر امسال ایک عجیب شان سے سامنے آیا اور اس نے دعوت رجوع الی القرآن اور تفہیم القرآن کیلئے وہ راہیں کھول دیں جن کی طرف وہم و گمان بھی نہیں جاتا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ۱۶ یوم کے ہندوستان کے دعوتی دورے سے ۲۵ اپریل کو واپس آنے کے بعد حسب معمول پاکستان میں دعوتی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ اس کے پہلو بہ پہلو ۵ مئی کو عمرہ ادا کرنے اور سعودی عرب کے بعض شہروں کا وزٹ ویزے کی بدولت دورہ کرنے کیلئے روانگی کے

انتظامات بھی ہو رہے تھے۔ اس پر مستزاد تنظیم اسلامی کے نویں سالانہ اجتماع (۲۵ تا ۳۰ مئی) کے انتظامی مسائل بھی پیش نظر تھے' جن پر ۳ مئی کو امیر موصوف محترم بھائی قمر سعید قریشی قیم تنظیم اسلامی سے تبادلہ خیال اور مشورے فرما رہے تھے۔ امیر محترم نے اس مشاورت میں راقم کو بھی طلب فرمالیا۔ اسی مشاورت کے دوران یہ مسئلہ بھی زیر گفتگو آیا کہ آنے والے رمضان المبارک میں جامع قرآن' قرآن اکیڈمی میں تراویح کا کیا انتظام ہو۔ امیر محترم نے فرمایا کہ ترویحہ کے دوران تلاوت کردہ حصہ کے اہم مطالب و مفاہیم پر کئی بار روشنی ڈالی جا چکی ہے' اس کے کیسٹ بھی تیار ہیں۔ انہی باتوں کا اعادہ کچھ جچتا نہیں۔ پھر موسم بھی گرمی کے لحاظ سے شدید سے شدید تر ہوتا چلا جائے گا۔ کوئی ایسا پروگرام سوچنا چاہئے کہ جس میں جدت بھی ہو اور افادیت بھی۔ نیز شرکاء کا ذوق و شوق بھی قائم رہے۔ پھر امیر محترم نے فرمایا کہ "اس موقع پر اچانک میرے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ کیوں نہ اس رمضان المبارک میں تراویح شروع ہونے سے قبل چار رکعتوں میں جتنا قرآن حکیم پڑھا جانے والا ہو' اس کا رواں ترجمہ' اہم نکات کی ممکنہ حد تک مختصر تشریح' ربط آیات اور نظم سور کے ساتھ بیان کیا جائے۔ پھر ہر ترویحہ میں اس سلسلہ کو جاری رکھا جائے۔ اس طرح اگر اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید حاصل رہی تو ۲۹ رمضان تک دورۂ ترجمہ قرآن مکمل ہو جائے گا۔" بھائی قمر سعید صاحب تو امیر محترم کے اس خیال پر پھڑک اٹھے اور انہوں نے اصرار کے ساتھ فرمایا کہ ایسا ضرور ہونا چاہئے۔ نیز موصوف نے فرمایا کہ اس طرح ان شاء اللہ یہ ترجمہ مختصر تشریحات کے ساتھ کیسٹوں میں ریکارڈ ہو جائے گا جس سے بے شمار طالبان فہم قرآن مستقل طور پر استفادہ کر سکیں گے۔

راقم نے بھی قمر بھائی کی رائے کی تائید کی۔ امیر محترم نے اس اندیشے کا اظہار فرمایا کہ "اگر یہ کام شروع کیا گیا تو ترجمہ قرآن کے اس کام میں اور بیس رکعات تراویح کی ادائیگی میں کم از کم چار ساڑھے چار گھنٹے کا وقت لگ جائے گا۔ اگر ہم صلوٰۃ عشاء ساڑھے نو بجے شب شروع کریں گے تو پیش نظر پروگرام دو بجے سے قبل ختم ہونا ممکن نہ ہو گا۔ شرکاء کے لئے یہ پروگرام بہت بھاری پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ اندیشہ ہے کہ شرکاء زیادہ تعداد میں اور پابندی کے ساتھ اس پروگرام میں شرکت نہ کر سکیں کیونکہ اس طرح پوری شب بیداری میں گزرے گی۔ مزید یہ کہ امسال گرمی کا موسم شدید ترین ہونے کے آثار ہیں اور رمضان المبارک کا پورا مہینہ جون میں گزرے گا جو گرمی کے اعتبار سے اس کے شباب کا مہینہ ہوتا ہے۔ لہٰذا کوئی فیصلہ کرتے وقت ان تمام امور کو سامنے رکھنا ہو گا"۔ بھائی قمر سعید کی رائے یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر یہ کام ضرور ہونا

کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔

پروگرام کے بارے میں بھائی قمر سعید قریشی کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ ابتداء ہی سے شرکاء کی تعداد پچھلے سالوں کے مقابلے میں زیادہ تھی بلکہ روزانہ اس تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ انجمن کی طرف سے اس پروگرام کا ۳۱ مئی کی اشاعت میں لاہور کے چند اخبارات میں اشتہارات کے ذریعہ اعلان کر دیا گیا تھا۔ لیکن حاضری میں اضافہ کا ایک اہم سبب یہ بنا کہ جو حضرات اس پروگرام میں شریک ہوئے جب انہوں نے اس کی افادیت کو محسوس کیا تو انہوں نے اس کا اپنے حلقہ تعارف و اثر میں تذکرہ کیا جس کے نتیجے میں شرکاء کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ قرآن اکیڈمی میں موسم بہار کے جشن کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ آخری عشرہ میں تو یہ کیفیت تھی کہ ہر شب کو قریباً یک صد موٹر کاریں جامع قرآن کے اطراف میں جمع ہو جاتی تھیں اور یہی کیفیت موٹر سائیکلوں کی ہوتی تھی۔ شدید گرمی کے باوصف شرکاء کا ذوق و شوق اور شغف دیدنی تھا۔ شرکاء کی کثیر تعداد اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات پر مشتمل تھی جس میں ڈاکٹرز' انجینئرز' پروفیسر' وکلاء' ممتاز صنعت کار اور تجار غرض کہ ہر شعبہ سے وابستہ افراد شامل تھے جو دن میں اپنے معمولات و مشاغل بھی ادا کرتے تھے اور شب میں اللہ کے گھر میں حالت قیام میں قرآن مجید کا سماع ہوتا اور حالت قعود میں تلاوت کئے جانے والے حصے کے پہلے سے ترجمہ اور تشریحات و توضیحات کے ذریعے قرآن حکیم کے علوم و معارف' حکم و عبر سے مستفید و مستفیض ہوتے۔ یقیناً نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد گرامی کا روزانہ ظہور ہوتا رہا ہو گا کہ ما اجتمع قومٌ فی بیتٍ من بیوتِ اللہ یتلون کتاب اللہ ویتدارسونہ بینھم الانزلت علیھم السکینۃ وغشیتھم الرحمۃ وحفتھم الملائکۃ وذکرھم اللہ فیمن عندہ ـــــ اس پورے پروگرام میں خواتین کی بھی اچھی خاصی تعداد شریک رہی۔ اس دورۂ ترجمہ قرآن کا یہ فائدہ بھی یقیناً ہوا ہو گا کہ تراویح میں تلاوت کردہ قرآن مجید کے حصے کے کم از کم پچیس فیصد مطالب و مفاہیم سامعین کے شعور و ادراک کی گرفت میں آتے رہے ہوں گے۔

جامع قرآن کے ہال' اس سے ملحق گیلری اور صحن میں قریباً سات سو نمازیوں کی گنجائش ہے لیکن پہلے ہی عشرے کے بعد تنگی داماں کا سماں پیدا ہو گیا اور آخری عشرے میں تو صورتحال یہ ہوئی کہ بعض مرتبہ شرکت کے خواہشمند اصحاب جگہ نہ ملنے کی وجہ سے واپس جانے پر مجبور ہوئے ـــــ گرمی بھی پورے شباب پر تھی لیکن اصلاً تو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تھا اور اس کتاب عزیز کا فیضان کہ اس کی کتاب مبین کے مطالب و مفاہیم سے واقفیت حاصل کرنے والے مشتاقان کے لئے

اس پورے پروگرام میں تسہیل پیدا ہو گئی اور کسی درجے میں سہی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی ایک کیفیت اور جھلک سامنے آ گئی اور اس کا عملی تجربہ ہو گیا کہ : "وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ" (فللہ الحمد والمنۃ)

معلوم ہوا ہے کہ ماضی میں اس ضرورت کے پیش نظر کہ جو کچھ نماز تراویح میں پڑھا جائے اس کا کچھ مفہوم بھی لوگوں کے علم میں آئے' بعض مشہور دینی درسگاہوں میں اس کا اہتمام کیا گیا کہ نماز تراویح کے آخر میں یا ہر چار رکعات کے بعد پڑھی گئی آیات کے چیدہ چیدہ نکات کا بیان ہو جائے' لیکن اس سلسلے کے ابتدائی تجربات لوگوں کی عدم دلچسپی کے باعث نہ چل پائے اور جن دینی درسگاہوں میں یہ مبارک سلسلہ شروع کیا گیا تھا وہاں اس سلسلے کو جلد ہی بند کرنا پڑا۔ ہماری معلومات کی حد تک پورے قرآن مجید کے ترجمے کی کوشش کہیں اور نہیں کی گئی۔ بہرحال ہر کام کیلئے اللہ کی مشیت میں ایک وقت متعین ہوتا ہے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق محترم ڈاکٹر صاحب کے شامل حال ہوئی کہ اس تبارک و تعالیٰ نے موصوف کے دل میں یہ خیال ڈالا' پھر ان کو انشراح قلبی عطا فرمایا' ان کو صحت دی ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ!

حافظ محمد رفیق سلمہ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے نوازے جن کے حسنِ قراءت نے نورٌ علیٰ نور کا کام کیا۔ ان کی قراءت کا یہ انداز تھا کہ قرآن حکیم کا ایک ایک لفظ سامعین کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

ذلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم

اس دورۂ ترجمہ قرآن کے تجربے کے بعد محترم ڈاکٹر صاحب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسلم معاشرے میں فی الوقت جو بے شمار مشرکانہ و مبتدعانہ اوہام و رسوم جاری و ساری ہیں اور شفاعت باطلہ کے جس عقیدے نے جڑیں پکڑ رکھی ہیں ان سب کا بڑی حد تک ازالہ عوامی سطح پر دورۂ ترجمہ قرآن سے ہو سکتا ہے اور خالص توحید کا فہم عوام الناس میں راسخ کیا جا سکتا ہے۔

رمضان المبارک کی عظمت اور صیام و قیام اللیل کی افادیت نیز ان کے باہمی ربط و تعلق کے متعلق راقم اپنی جانب سے کچھ عرض کرنے کے بجائے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی نہایت مختصر لیکن حد درجہ جامع تالیف "عظمت صوم" کے چند اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہے جس سے یہ بات بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم والے معاملے کو حل کرنے کیلئے کس طرح اللہ تعالیٰ نے محترم ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی فرمائی اور ان کو اس سعادت سے نوازا اور ان کیلئے نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد مبارک کا اہل و مصداق بننے کا موقع مرحمت فرمایا :

من قال به صدق ومن عمل به أُجرَ ومن حكَم به عدَل ومن دعا اليه هُدِيَ الىٰ صراطٍ مستقيم

"اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ رمضان المبارک کے پروگرام کی دو شقیں ہیں۔ ایک دن کا روزہ اور دوسرے رات کا قیام اور اس میں قراءت و استماع قرآن! اور اگرچہ ان میں سے پہلی شق فرض کے درجے میں ہے اور دوسری بظاہر نفل کے' تاہم قرآن مجید اور احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام دونوں نے اشارتاً اور کنایتاً واضح فرمایا کہ یہ ہے رمضان المبارک کے پروگرام کا جزو لاینفک! (یہی وجہ ہے کہ احناف کے نزدیک نماز تراویح واجب کے درجے میں شمار ہوتی ہے) ـــــ چنانچہ قرآن نے وضاحت فرمادی کہ روزوں کیلئے ماہ رمضان معین ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں قرآن مجید نازل ہوا تھا' گویا یہ ہے ہی نزول قرآن کا سالانہ جشن!! ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ ﴾ "رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔" اور احادیث نے تو بالکل ہی واضح کردیا کہ رمضان المبارک میں "صیام" اور "قیام" لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ :

۱۔ امام بیہقی نے رمضان المبارک کی فضیلت کے ضمن میں جو خطبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا "شعب الایمان" میں نقل کیا ہے' اس کے الفاظ ہیں :

((جعل الله صيامَه فريضةً وقيام ليلِه تطوعًا))

"اللہ نے قرار دیا اس میں روزہ رکھنا فرض اور اس کا قیام اپنی مرضی پر"

گویا قیام اللیل اگرچہ "تطوعا" ہے تاہم اللہ کی جانب سے "مجعول" بہرحال ہے۔

۲۔ بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

((مَن صام رمضان ايمانًا واحتسابًا غُفِرَ له ما تقدَّم مِن ذنبه ومَن قام رَمضان ايمانًا واحتسابًا غُفِرَله ما تقدّم مِن ذنبه))

"جس نے روزے رکھے رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ بخش دیئے گئے اس کے تمام سابقہ گناہ۔ اور جس نے (راتوں) کو قیام کیا رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ بخش دیئے گئے اس کے جملہ سابقہ گناہ"۔

۳۔ امام بیہقی نے "شعب الایمان" میں حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاص سے روایت کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

((الصيام والقرآن يشفَعان للعبد' يقول الصيام : اى رب انى منعتُه الطعامَ والشهواتِ بالنّهار فشَفِّعنى فيه' ويقول القرآن منعتُه النومَ بالليل فشفعنى فيه' فيُشَفَّعان))

"روزہ اور قرآن بندۂ مومن کے حق میں سفارش کریں گے۔ روزہ کہے گا اے رب! میں نے اسے روکے رکھا دن میں کھانے اور خواہشات سے پس اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما اور قرآن کہے گا میں نے روکے رکھا اسے رات کو نیند سے پس اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما تو دونوں کی سفارش قبول کی جائے گی"۔

اور اب ذرا غور فرمایئے صوم رمضان کی حکمتوں پر!

حقائق متذکرہ بالا کے پیش نظر صیام و قیام رمضان کی اصلی غایت و حکمت اور ان کا اصل ہدف و مقصود ایک جملے میں اس طرح سمویا جا سکتا ہے کہ : ـــــ ایک طرف روزہ انسان کے جسد حیوانی کے ضعف و اضمحلال کا سبب بنے تاکہ روح انسانی کے پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیاں کچھ ہلکی ہوں اور بہیمیت کے بھاری بوجھ تلے دبی ہوئی اور سسکتی اور کراہتی ہوئی روح کو سانس لینے کا موقع ملے ـــــ اور دوسری طرف قیام اللیل میں کلام ربانی کا روح پرور نزول اس کے تغذیہ و تقویت کا سبب بنے ـــــ تاکہ ایک جانب اس پر کلام الٰہی کی عظمت کماحقہ منکشف ہو جائے اور وہ اچھی طرح محسوس کر لے کہ یہی اس کی بھوک کو سیری اور پیاس کو آسودگی عطا کرنے کا ذریعہ اور اس کے دکھ کا علاج اور درد کا درمان ہے ـــــ اور دوسری جانب روح انسانی از سر نو قوی اور توانا ہو کر "اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز" ہو گویا اس میں تقرب الی اللہ کا داعیہ شدت سے بیدار ہو جائے اور وہ مشغول دعا و مناجات ہو جو اصل روح ہے عبادت کی اور لبِّ لباب ہے رشد و ہدایت کا!

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں صوم رمضان سے متعلق آیات میں :

اولاً ـــــ مجرد صوم کی مشروعیت اور اس کے ابتدائی احکام کا ذکر ہوا اور اس کی غرض و غایت بیان ہوئی "لعلّکم تتقُون" کے الفاظ میں اور ثانیاً ـــــ صوم رمضان کی فرضیت اور اس کے تکمیلی احکام کا بیان ہوا اور اس کے ثمرات و نتائج کا ذکر ہوا دو طرح پر :

ایک ـــــ "وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰیکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ" کے الفاظ میں جو عبارت ہے انکشاف عظمت نعمت قرآن اور اس پر اللہ کی جناب میں ہدیہ تکبیر و شکر پیش کرنے سے ـــــ اور دوسرے ـــــ "وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ .... لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ" کے الفاظ میں جو عبارت ہے انسان کے متوجہ الی اللہ و متلاشی قرب الٰہی اور مشغول دعا اور محو مناجات ہونے سے جو اصل حاصل ہے عبادت رب کا!

الغرض! صیام و قیام رمضان کا اصل مقصود یہ ہے کہ روح انسانی بہیمیت کے غلبے اور تسلط سے نجات پا کر گویا حیات تازہ حاصل کر لے اور پوری شدت و قوت اور کمال ذوق و شوق کے ساتھ اپنے رب کی جانب متوجہ ہو جائے۔"

4۔ **مسجد اقصیٰ**، میاں پارک، تاج پورہ سکیم، اپروچ روڈ

مدرس : **پروفیسر حافظ محمد اشرف**

نماز تراویح کے بعد ترجمہ مع مختصر تشریح بیان کریں گے۔

5۔ **جامع مسجد بلال**، رچنا ٹاؤن (فیروز والہ)

مدرس : **حافظ علاؤ الدین**، (ایم اے اسلامیات) امیر لاہور غربی

نماز تراویح کے بعد ساڑھے آٹھ بجے ترجمہ قرآن کا آغاز ہو گا

☆ ☆ ☆

جزوی دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام

(نماز تراویح کے بعد صرف ایک گھنٹہ۔ بذریعہ ویڈیو کیسٹ)

(1) برمکان تجمل حسن میر، مکان 28 / 27 گلی نمبر3 (اقبال مسجد والی گلی) پریم نگر، ساندہ روڈ لاہور

(2) برمکان نثار احمد خان، مکان A / 20 گلی B / 55 خیبر پارک نمبر2، نزد جمیل کوارٹرز، سنت نگر

(3) برمکان شکیل احمد، F / 47 لارنس روڈ لاہور (نزد ادارہ انتقال خون)

(4) برمکان مبارک گلزار، مکان 2069 / B نزد مسجد جمال مصطفیٰ، بیرون موری گیٹ

(5) برمکان سید احمد حسن، D-16، انکم ٹیکس کالونی ستلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن فون : 5413420

(6) برمکان فیاض اختر میاں۔ A / 323 مہران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن فون : 5416936

(7) برمکان امیر الدین۔ A / 3 داروغہ سٹریٹ، چاہ وزیری والا، ڈھولنوال فون : 7599739

(8) برمکان اخلاق احمد۔ 44۔ منظور پاک، آخری ویگن سٹاپ گلشن راوی فون : 7418571

(9) برمکان شیخ محمد افضال، جسٹس شریف کالونی، سمن آباد لاہور فون : 7560122

(10) برمکان محمد عباس، مکان 1 گلی نمبر1، شاہ کمال روڈ فون : 7583315

(11) برمکان اشفاق احمد، قیوم پارک شاہدرہ لاہور (برائے خواتین)

Jan. 1998 Reg. No. CPL. 126
MONTHLY Vol. 17
Hikmat-e-Quran
LAHORE No. 1

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان ــــ اور ــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ــــ اور ــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ــ اور ــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ